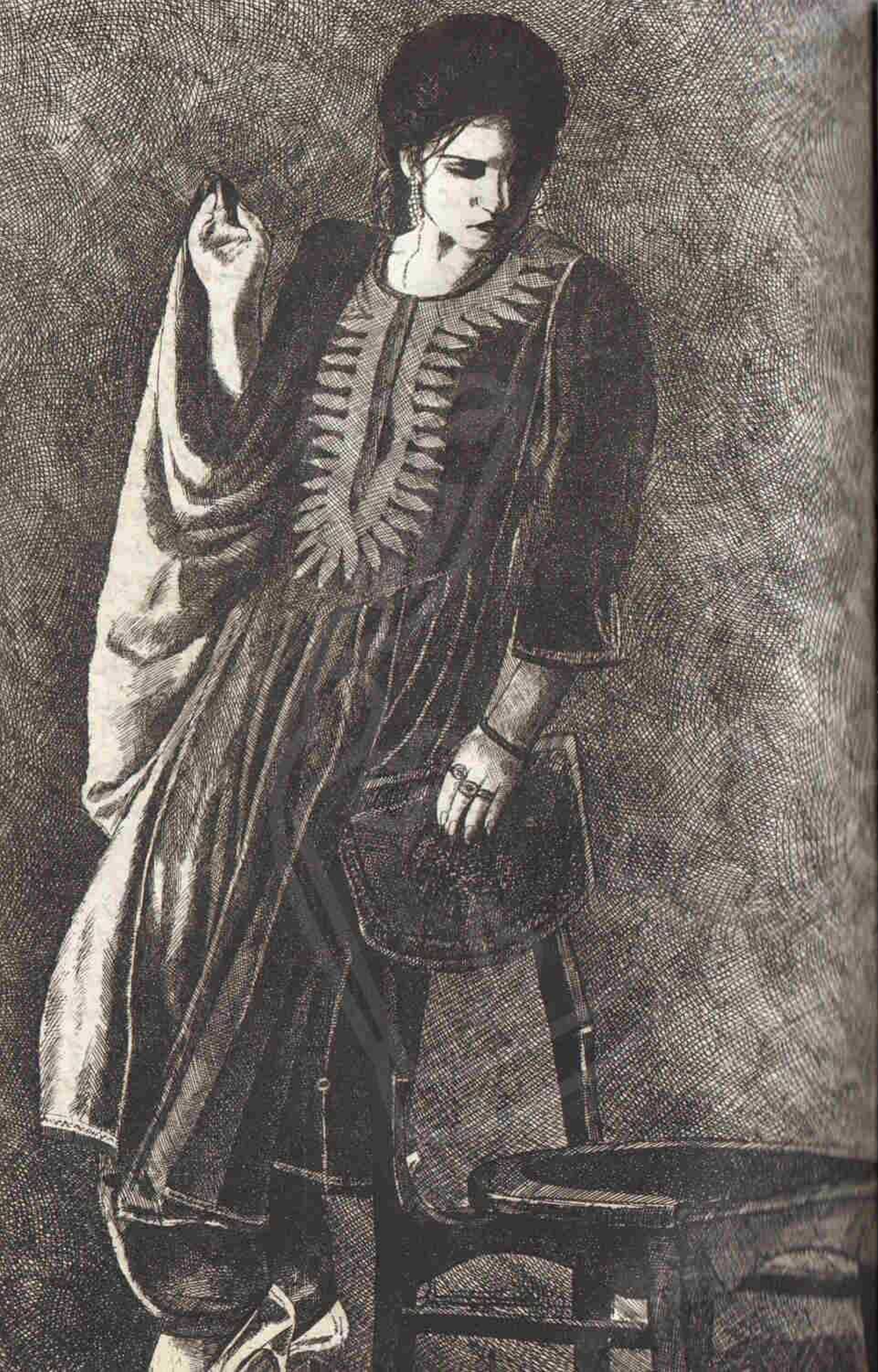

مکمل ناول

اس کی خاطر

آسیہ رزاقی

اس بار وہ کافی دن بعد آئی تھی۔ شاید دو یا ڈھائی سال کے بعد۔

گیٹ پر اُسے تانگے سے اُترتے دیکھ کر سب کے منہ بن گئے۔ سامنے لان میں بیٹھے تھے سب۔

نوید۔ ندا معید۔ دریدہ، نوید کا دوست افتخار جو ساتھ والی کوٹھی میں رہتا تھا اور اُسے نوید کا جانثار ہونے کا دعویٰ تھا۔

وہ حسبِ سابق سیاہ اور سرخ چھینٹ کی چادر میں ملفوف ایک پرانا اٹیچی اُٹھائے، مسکراتی ہوئی اُن کی طرف بڑھی۔

سب بغور اُسے دیکھتے رہے، کوئی اپنی جگہ سے اُٹھا ہی نہیں۔ جب وہ پورچ میں کھڑی اپنی چھینٹ کی چادر سے ماتھے اور گردن کا پسینہ پونچھ رہی تھی تو اندر سے صبا نمودار ہوئی اور آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے اُس سے ملی (صبا میں بزرگانہ خصلت وافر مقدار میں تھی)

"نانی کہاں ہیں؟"

"اندر ہی ہیں، آؤ ناں۔"

لان میں مجسمہ بنے لوگوں پر فہمائش کی نظر ڈال کر صبا اُسے اندر لے گئی۔ خواہرانہ جذبات کے تحت اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر، اٹیچی مگر اُسی کے ہاتھ میں رہا۔ صبا نے اُس کے ہاتھ سے لینے کی زحمت نہ کی۔ شاید

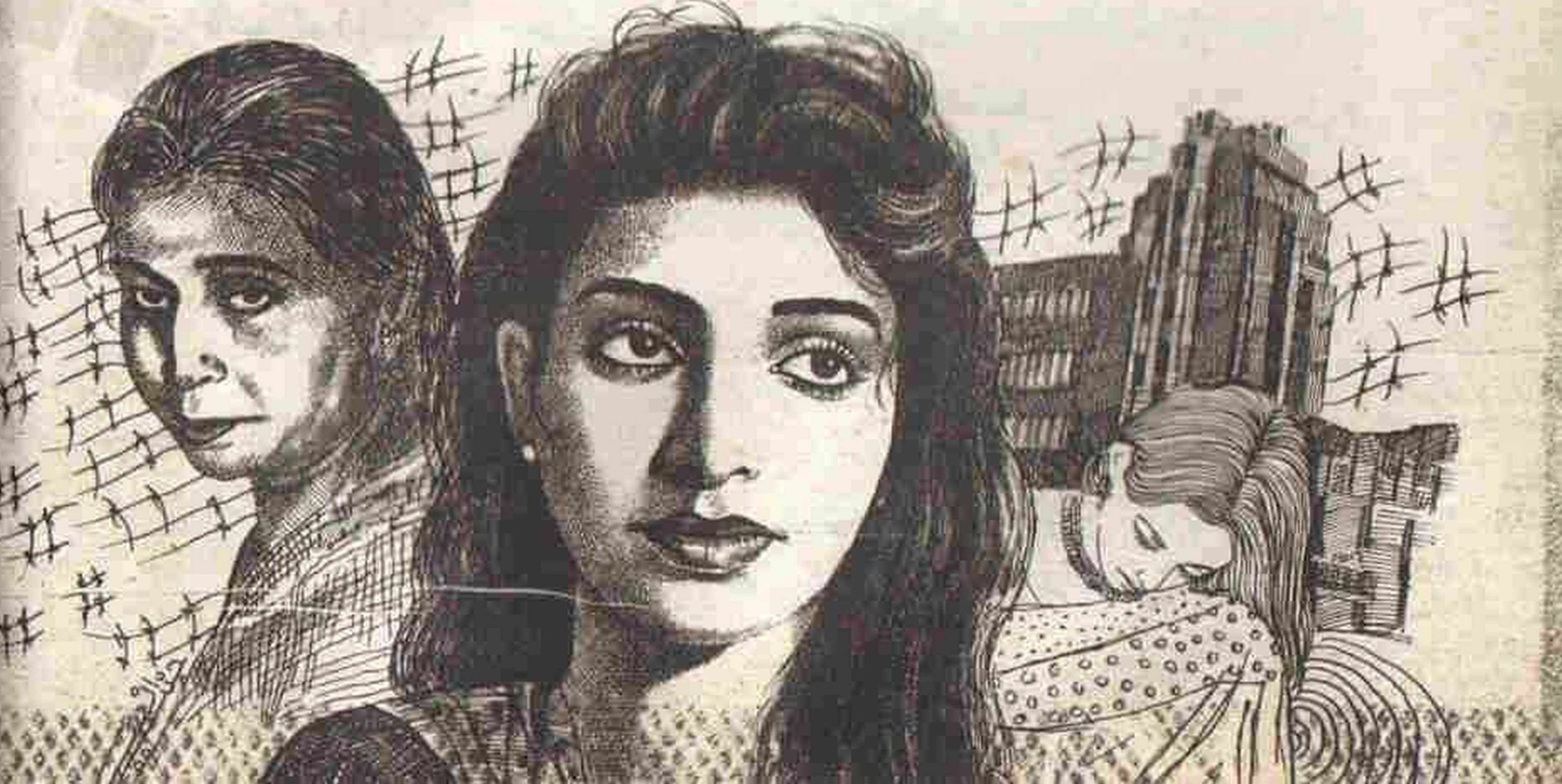

اس لیے کہ اُس کا خیال تھا کہ اپنے حصے کا بوجھ خود ہی اُٹھانا چاہیے۔

دادی کمرے میں لیٹی پان چبا رہی تھیں اور گنگنا رہی تھیں، اُسے دیکھ کر نہال ہو گئیں۔

دادی میں بھی آخر کار نئے زمانے کے اثرات چھانے لگے تھے۔ بناوٹ، شو بازی، منافقت، صبا جانتی تھی کوئی ایسا مہمان جو اُن کے کمرے میں قیام کرے، اُنہیں زہر لگتا ہے، مگر اس وقت وہ خوش ہو کر اُسے گلے لگا رہی تھیں جبکہ دو ڈھائی سال سے وہ نہیں آئی تھی تو انہیں کوئی فکر نہ تھی۔

"شادی وادی ہو گئی ہو گی۔ ائے گنواروں میں کم عمری میں بیاہ دیا جاتا ہے۔"

وہ دادی کی بہن کی نواسی تھی۔ ایک دور دراز کے قصبے میں رہائش تھی اس کی۔ دادی اس کی ماں سے بہت پیار کرتی تھیں، جب کہ اس کے باپ اور اس کے ددھیال کا ذکر خاصے تحقیری انداز میں ہوتا، کیونکہ وہ لوگ گاؤں کے زمیندار تھے۔ پہلے تو وہ باقاعدگی سے ہر سال آیا کرتی۔ صبا کی امی کا منہ بن جاتا۔ ان کے بچوں کے امتحان ہو رہے ہوتے یا ہونے والے ہوتے، سب پڑھائی میں غرق ہوتے کہ وہ آ جاتی۔

"بھئی اسے تو پڑھنا وڑھنا ہے نہیں، مگر ہمارے بچوں کو تو پڑھنا ہے، آگے بڑھنا ہے۔ ان کی زمینداری تو ہے نہیں کہ کھانے کی پروا نہ ہو۔ یہ ڈسٹرب ہوتے ہیں۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا۔"

وہ صاف کہہ دیتیں۔ حالانکہ اس کی وجہ سے کوئی ڈسٹرب نہ ہوتا۔ کسی کو اس کی آمد کی خبر تک نہ ہوتی. یا پھر پروا نہ ہوتی۔ کوئی اس سے مخاطب تک نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ ایک گاؤں کی پینڈو لڑکی تھی۔ جاہل باپ کی جاہل اولاد۔ اور وہ تھی بھی خاموش طبع۔ دبی دبائی سی۔ پھر چند دن اپنی نانی یعنی صبا کی دادی کی پُرخلوص شفقت سے فیض یاب ہونے کے بعد اپنی پھوپھی کے گھر چلی جاتی۔

اس کے بعد امتحانوں کے خاتمے پر ہی اس کی صورت نظر آتی۔ اس کی پھوپھی کا سُوکھا چمرخ بیٹا اسے چھوڑنے آتا۔ جاتے ہوئے وہ اُسے تانگے کی سواری کے دو روپے ضرور دیتی اور اس سلسلے میں اُس کی لڑکے سے خاصی حجت ہوتی۔ وہ انکار کیے جاتا، یہ زبردستی نوٹ اُس کے ہاتھ میں ٹھونسے جاتی۔ پھر اس کی جیب میں نوٹ ڈال کر یوں تھپتھپاتی، جیسے وہ لاک ہو گیا ہو اور چابی کے بغیر نہیں کھلے گا۔ نوٹ دینے کے بعد بڑی مطمئن اور آسودہ سی گیٹ کے اندر آ جاتی۔

لیکن اس بار وہ دو سال کے بعد آئی تھی اور کسی نے اُسے کبھی یاد بھی نہیں کیا تھا، لیکن اب دو سال کی غیر موجودگی کا سبب آن کا موضوع گفتگو تھا۔

نوید اندازے لگائے جا رہا تھا۔ افتخار اسے رد کیے جاتا۔

"اور سناؤ؟" صبا نے ازراہِ عنایت اُس کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"سب ٹھیک تو رہے؟"

حالانکہ صبا کو "سب" کا علم ہی نہ تھا، یہ کہ اس کے کتنے بہن بھائی ہیں، کہاں ہیں، پڑھتے ہیں کہ ـــ!

"ہاں جی۔" اُس نے مستعدی سے سر پر دوپٹا جما کر کہا۔ "شکر ہے۔"

دادی اُسے بغور دیکھ رہی تھیں۔

"کمزور لگ رہی ہو، کیا بات ہے، ماں ٹھیک ہے تمہاری؟"

"جی، وہ تو ٹھیک ہیں، ابا جی ٹھیک نہیں ہیں۔"

"اچھا! خیر، وہ کس دن ٹھیک رہتا ہے، سدا کا بیمار ہے، جوانی میں کبھی صحت مند نہ دیکھا اُسے۔ تیری نانی اللہ اُسے بخشے، میری اُس سے ہمیشہ لڑائی رہی، ایسی مورتی جیسی خوبصورت لڑکی اُٹھا کے بڈھے کے حوالے کر دی، ناقدرے لوگ، ساری عمر بے چاری نے رو رو کر ـــ!"

جملہ ادھورا چھوڑنا دادی کا پرانا حربہ تھا۔ بعض دفعہ تو مطلب بھی واضح نہیں ہوتا تھا۔

"ابا بڈھے تو اب بھی نہیں ہیں نانی۔" وہ مسکرائی۔

"بس یہ ہے کہ ـــ!"

"اب جوان ہو گیا ہو گا۔" دادی منہ بنا کر بولیں۔ صبا کو ہنسی آ گئی۔

"نانی! آپ کی طبیعت کیسی ہے، ٹھیک تو ہیں

آپ؟" وہ سمٹ کر بولی۔

"بس بیٹا! جی رہی ہوں۔ بدن میں درد، سر میں بھاری پن، جوڑ جوڑ بے کار۔ سارے بڑھاپا تو سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔"

شام تک دادی کی اچانک عود کر آنے والی بیماریوں کا گھر بھر کو علم ہو چکا تھا۔ تیمار دار جو مفت کا مل گیا تھا اور یہ کوئی انوکھی بات تھی بھی نہیں۔ وہ جب آتی جتنے دن رہتی، دادی کی تیمار داری کرتی۔ جوڑوں پر مالش، سر پر مالش، جسم دبانا۔ غرض کہ دادی کو مخلص نرس مل جاتی۔ تیمار داری اور خدمت سے وقت بچتا تو اپنے پرانے بکس سے کتابیں نکال کر پڑھتی اور اس کا موقع تو رات کو ہی ملتا تھا، جب سب اپنے اپنے کمروں میں بند ہو جاتے۔

"ہاہ! بچی کو پڑھنے کا کتنا شوق ہے، مگر وہاں گاؤں میں تو تعلیم کو عیب سمجھا جاتا ہے، چلو کچھ شدبد ہو جائے گی۔ صبا بیٹا کچھ اپنی اس بہن کو بھی پڑھا سکھا دو۔"

دادی بڑی دردمندی سے صبا کو بلا کر کہتیں۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" صبا فرض شناسی کا مظاہرہ کرتی۔

"مگر دادی اماں! ابھی تو مجھے کام ہے۔"

"اچھا بیٹا! پھر جب وقت ملے، تم آ جانا۔"

صبا جب آتی، وہ دادی کے پیر پر مالش کر رہی ہوتی یا ان کے کپڑے سِل رہے ہوتے یا ـــ شوق پورا ہی نہ ہوتا، صبا کا پڑھانے کا، اس کا پڑھنے کا۔

ممانی نے اُسے غور سے دیکھا، پہلے کے مقابلے میں رنگ نکھر گیا تھا۔ اس کی پتلی ستواں ناک میں ایک لونگ کا اضافہ ہوا تھا۔ باقی سب تو وہ ویسی کی ویسی تھی۔ ایک موٹے چادر نما دوپٹے میں۔ اُس کا سر، شانے اور کمر ڈھکے رہتے۔ جسامت کا پتا ہی نہ چلتا۔ سر جھکائے کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی۔ ممانی کو بھی اپنی گرتی ہوئی صحت، بالوں کی خشکی اور یادداشت کی کمزوری، ہاتھوں کے سُن ہو جانے کا احساس ہوا۔ وہ ان کی صحت کے بارے میں بہت فکر مند ہو گئی۔

نانی یعنی صبا کی دادی کے کام سے فارغ ہو کر وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

"ممانی! آپ بادام کھایا کریں اور مغزیات، یعنی کدو، ککڑی، کھیرے اور خربوزے، تربوز کے بیجوں کا حلوہ بنا کر صبح شام کھائیں۔ نہیں آتا؟ اچھا میں بنا دوں گی۔"

وہ بہت ہی کم بولتی اور جب بھی کوئی بات کرتی وہ دوسروں کی صحت کے بارے میں ہوتی۔

"ندا کے منہ پر دانے نکل رہے ہیں۔ رات کو بورک پوڈر لگا کر سو جائے، صبح کو گال صاف، کچی سبزی بھی کھانی چاہیے۔"

نوید نے اُسے ڈاکٹرنی کا خطاب دے دیا۔

"گاؤں میں ڈاکٹرنی ہی کہا جاتا ہے۔" اس نے اپنے دوست کو بتایا۔

"بلکہ ڈاکٹر کی مسز جو کہ ڈاکٹر ہرگز نہیں ہوتی۔ وہ بھی ڈاکٹرنی ہوتی ہے۔ ماسٹر کی بیوی ماسٹرنی، بلکہ ماسٹریانی۔"

"مگر یہ کسی کی بیوی نہیں ہے۔" افتخار نے اعتراض کیا۔

"تو نہ ہو، مگر علاج کرتی ہے تو ڈاکٹرنی شریف ہے جتنے شعبے ہیں اس میں "ی" لگا دو، بلکہ نی لگا دو، تو اعزازی ڈگری مفت میں ـــ"

"ریسلنگ آ رہی ہے۔" لاؤنج سے معید نے ہانک لگائی۔

دونوں ہڑبڑا کر اُٹھے، اندر بھاگے۔ صبا نے انہیں اندھوں کی طرح بلکہ باؤلوں کی طرح چیزوں سے ٹکراتے بھاگتے دوڑتے دیکھا۔

افتخار نے تو درمیان میں آنے والی میز پر جمپ لگا لی۔ نوید کو اتنی بڑی چیز نظر آئی نہ افتخار کی جمپ۔ اپنے ہی زور میں میز سے ٹکرا کر گرا اور چیخ اُٹھا۔

"انسان بننے کی کبھی تو کوشش کر لیا کرو بھائی۔" صبا بعض اوقات بڑی بہنوں کی طرح جھڑک دیتی تھی۔ واویلا کرتے نوید کو ہاتھ کا سہارا دے کر اُٹھایا بھی۔

"ریسلنگ!" نوید نے گھٹنا پکڑ کر لنگڑاتے ہوئے کہا اور لاؤنج میں داخل ہو گیا۔

اس وقت انجو ممانی کے سر کی تیل مالش کر کے آ رہی تھی۔ بالکل اتفاق تھا کہ دونوں آمنے سامنے آ گئے بہت ہی معمولی ٹکر ہوئی، مگر پیالی سے تیل چھلک کر

نیچے زمین پر گر گیا۔ نوید نے قدرے حجالت سے جاتی ہوئی انجو سے سوری کہہ کر منہ پر بناوٹی مسکراہٹ بھی بکھیر لی اور بے خیالی میں چھپ سے تیل پر پیر رکھ دیا اور نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ چکنے فرش پر چکنا تیل۔ پیر پھسلا تو وہ بھی پھسلتا چلا گیا۔ ایک ہی جست میں جانے کہاں جا پہنچا۔ عین ٹی وی کے سامنے دھم سے جا گرا۔ پبلک جو ٹی وی میں آنکھیں گاڑے ریسلنگ دیکھ رہی تھی یکدم چلا اٹھی۔

"ہٹو۔ سامنے سے ہٹو جاہل"۔

"بھائی کی یہ بہت بری عادت ہے آئیں گے اور ٹی وی کے سامنے ڈھیر ہو جائیں گے"۔

دردانہ نے سب سے چھوٹے بھائی سعید کو مطلع کیا۔ ابا جان وہیں چوکی پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔

افسوس کے انداز میں عینک کے اوپر سے دیکھ کر ہونٹ سکوڑ کر بولے۔

"چہ۔ چہ بیٹا! اتنی بھی کیا جلدی تھی، پہلوان کہیں بھاگے نہیں جا رہے، جن کو دوڑ کر پکڑنا تمہارے فرائض میں داخل ہے"۔

ٹانگیں چر گئی تھیں۔ بمشکل انہیں سمیٹ کر وہ بیٹھا پھر مڑ کر دیکھا۔ انجو غائب ہو چکی تھی۔ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ اس کے گرائے تیل نے کتنی گڑبڑ کر دی۔

"اب کوئی تیل مالش نہیں ہوگی یہاں۔ اس کی ایسی کی تیسی"۔

اس نے مکا زمین پر مار کر غصے کا اظہار کیا۔ مکا جو تنی میں کچھ زور سے لگ گیا۔ چوٹ نے احساس دلایا کہ وہ ابھی تک اسی تیل پر بیٹھا ہے، جس سے پھسلا تھا اور یہ کہ اس کی نئی جینز کی ایسی تیسی ہو چکی ہے۔

ممانی کو یک دم ہی احساس ہوا کہ خوامخواہ کے خرچے بڑھ گئے ہیں۔ کھانے پینے کے شوق اور ذوق کا معیار خاصا بلند ہو گیا ہے۔ شام کو چائے کے ساتھ شامی کباب مزے کرنے لگے۔ رات کو کھانے پر تکے، بریانی ضرور ہوں۔ ناشتا نہاری کا ہو۔ بھلا جہاں کمانے والا ایک اور کھانے والے دس ہوں، یہ اللّے تللّے کیسے ممکن ہیں۔ بچت کرنا ضروری ہے۔ بوا شریفن کو دو ماہ کے لیے جبری رخصت پر بھیج دیا گیا۔ چلتے چلتے وہ کہہ گئیں۔

"دو مہینے خالی تو نہیں بیٹھوں گی، کہیں نہ کہیں روزگار لگ ہی جائے گا۔ پھر کیا پتا بی بی! آپ دوسری رکھ لیں"۔

اب صبا کچن میں ہے، برتن دھو رہی ہے، پیاز کاٹ رہی ہے، روٹی پکا رہی ہے تو انجو کس طرح دیکھ سکتی ہے لہٰذا اس نے سارے کام اپنے ذمے لے لیے۔ صبا اوپر کے کام پر لگ گئی۔ ہزار کام ہوتے ہیں گھر میں۔ شریفن ہزار کام تو نہیں کرتی تھی پھر بھی اب ممانی کو اس کی بہت یاد آتی تھی۔ اس کے کام کی صفائی، تیزی، دیسی روٹی بھلا کون پکا سکتا ہے، مگر افسوس اور یہ سب اس لیے ہوا کہ کھانے والے دس اور کمانے والا ایک اور صاحبزادے کو احساس ہی نہیں۔

"میں نوکری نہیں کر سکتا، بزنس کروں گا"۔ ہر وقت کے واویلا کا ٹکا سا جواب دیا نوید نے۔

"آئے ہائے، بزنس۔ باپ نے کون سا تیر مار لیا، رقم چاہیے میاں"۔

"ابا جان نے وعدہ کر لیا ہے، وہ دیں گے سرمایہ"۔

"ہونہہ! سرمایہ۔ ہوگا تو دیں گے ناں"۔

"لاکر بھرے ہیں نوٹوں سے، پچاس جگہ پیسہ لگایا ہوا ہے اور کیا چاہیے، آپ کو کفرانِ نعمت کی عادت ہے"۔

"اچھا چپ، حلق میں لاؤڈ اسپیکر فٹ کرا لیا ہے کمبخت نے۔ اعلان کرنا پھر گلی بازار میں"۔

"اعلان کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سب کو پتا ہے سوائے اس بے چاری پینڈو کے۔ آپ اسی پر تو اپنی عزت کا رعب جھاڑنا چاہتی ہیں"۔

انہوں نے ادھر ادھر چوروں کی طرح دیکھا۔ دبے پاؤں باہر نکل کر گیلری میں جھانکا پھر کمرے میں گھس کر نوید کو دو ہتڑ رسید کیا۔

"کمبخت کہیں کے، ذرا جو لحاظ ہو"۔

"شکر ہے پینڈو جا چکی تھی۔ نوید ہنستا رہا۔ ڈھیٹ کہیں کا۔

نوید کے دوستوں کی یلغار سے سب ہی عاجز تھے جو منہ اٹھائے گھسے آتے تھے۔ کچن تک ان کی رسائی تھی۔

"باجی! ذرا سی چائے چاہیے، بس چار پیالی، زیادہ تکلف کی ضرورت تو نہیں لیکن آپ کے ہاتھ کے پکوڑے بھولتے ہی نہیں"۔

وہ سب مارے احترام کے صبا کو باجی کہتے۔ شاید وہ بردبار، باوقار نظر آتی تھی، اس لیے۔

ایک دن تو حد ہو گئی۔ انجو برتن دھو رہی تھی۔ اپنا وہی ملگجا دوپٹا اوڑھے ہوئے تھی۔ ایک لڑکا دندناتا ہوا آیا۔ بڑی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"اے۔ اے! چھوڑو برتن! پہلے چائے بناؤ، ساتھ میں کچھ نمکین"۔

کہہ کر اسے کھینچتے ہوئے چولہے کے پاس لایا۔ اس کی ارے، ارے کی فریاد سنے بغیر باہر چلا گیا۔ صبا سن کر ہنس دی۔

"یہ بھائی کے دوست ہیں ناں، سب انہی کے جیسے ہا ہو ہیں، ان کی پروا نہ کیا کرو، دل کے برے نہیں ہیں"۔

وہ چاہنے کے باوجود نہ کہہ سکی کہ جوان لڑکیوں کے گھر میں لڑکوں کا بے محابا آنا ٹھیک نہیں۔

اس دن کے بعد اس نے شام کو کچن میں جانا چھوڑ دیا اور پھر پھوپھو کے ہاں رہنے چلی گئی۔ ممانی نے روکنے کی کوشش کی تو اس نے مجبوری ہے کہہ کر پھوپھو کے سوکھے چمرخ بیٹے کو اچھی تھما دیا۔ جو تانگہ لے کر آیا تھا۔ (سواری گیٹ پر کھڑی تھی)

صبا کیا کیا کرتی۔ امی سے اس نے کہہ دیا کہ وہ سب کام نہیں کر سکتی۔ ندا سے کہیں مدد کر دیا کرے۔ شریفن بوا بلائی گئیں۔ انہوں نے ترکا سا جواب دے دیا۔ البتہ ایک جوان لڑکی عوضانے کے طور پر بھیج دی۔

صبا تو یوں بھی بے پتے کی تھی، مگر ندا سے تو ایک پیالی بھی نہ پیا جاتا۔ جونہی کام کا وقت آتا، وہ کراہنا شروع کر دیتی اور ادھر ادھر بستر، تخت یا دادی کے پاس لیٹ جاتی۔ گویا اسے کوئی بہت سخت تکلیف ہو رہی ہے اس لیے شریفن کی بھیجی ہوئی مسٹنڈی کو قبول کر لیا گیا۔ جو کام کم کرتی، ہنستی زیادہ۔ اس کے ہاتھ سے گلاس اور پیالیاں بھی ٹوٹتی رہیں۔ ہر وقت کی شکایت سن سن کر اخلاق صاحب نے کہا۔

"ڈھنگ کا نوکر رکھو"۔

اور پھر اتفاق سے پرانا خانساماں آ گیا، مگر شریفن کی بھانجی نے مہینہ ختم ہونے سے پہلے جانے سے انکار کر دیا۔

"یا تو تنخواہ پوری دو، ورنہ کام مہینہ بھر لو"۔

صبا کی امی بہت سوچ سمجھ کر کام کرتی تھیں۔ انہوں نے پورے مہینے کام کا موقع دیا۔ اس نے خوب پُرزے نکالے۔ خانساماں اس کی موجودگی میں جون بدل لیتا، کاہلی رخصت، بال سنورتے، دانت نکلتے، پھر کچن سے ہی ہی، ہا ہا کی آوازیں۔ نوید کے دوست بھی اکثر وہاں پائے جاتے۔ وہیں چائے پینا مرغوب ہو گیا۔ چائے کے ساتھ مفت کی نظارا بازی اور ڈراما۔ بھانجی صاحبہ گلوکارہ بھی خاصی تھیں۔ آنکھیں مٹکانا، دانت نکالنا

پاک و ہند کے مشہور شاعر
ڈاکٹر بشیر بدر
کے مجموعے
آمد ـــــــ قیمت /50 روپے
آسمان ـــــــ 70/-
امیج ـــــــ 60/-
آہٹ ـــــــ 60/-
اور
کلیاتِ بشیر بدر
قیمت -/250 روپے
ہر اچھے بک اسٹال پر دستیاب ہیں
سول ایجنٹ مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37۔ اردو بازار، کراچی

تو آنا ہی تھا۔ اب گنگنا کر آواز کے جوہر دکھانے لگیں۔ تب امی کو فکر ہوئی۔ بلکہ نوید کو بھی جب بچپن سے دلچسپی ہو گئی، خاصی ہیر رانجھا کی اسٹوری پرورش پا رہی تھی جس میں ہیر ایک تھی، رانجھا بدلتا رہا۔ نوید اور حمیدن، افتخار اور حمیدن، خانساماں اور حمیدن۔ مہینہ ختم ہونے میں ابھی آٹھ دن باقی تھے کہ پوری تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھی۔ ڈرائیور کے ساتھ رات ہی رات میں اس کی خالہ کے پاس بھیج دیا۔

صبح انجو پہنچ گئی۔ سب نے سکون کا سانس لیا۔ کم از کم برتن دھونے کی مشقت سے جان چھوٹی۔ خانساماں کی تو پہلی شرط ہی یہ تھی کہ وہ برتن نہیں دھوئیں گے، مگر انجو نے خاصا دلگیر کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ وہ صرف دو دن کے لیے آئی ہے۔ وہ کچھ کمزور نظر آ رہی تھی۔ ممانی طنز سے باز نہ آئیں۔

"آئے ہائے۔ انجو اتنی زرد ہو گئی ہو۔ لگتا ہے کھانے کو کچھ ملا ہی نہیں اتنے دن، اور پھپھو کے گھر شاید آرام بھی نہیں ملا۔"

"ہاں تو کام کرنے والے کو آرام کہاں، جیسے یہاں کرتی تھی، وہاں بھی لگی رہتی ہو گی۔"

نانی نے اس کی سائڈ بھی لی اور بہو پر طنز بھی کر دیا۔

"مگر یہاں کھانے پینے کا تو آرام تھا۔ یہاں سے تو اچھی بھلی گئی تھی۔"

"میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔"

"ارے کیا ہوا تھا؟" صبا نے پوچھا۔

"بس بخار آ گیا۔"

"پھر علاج کروایا؟" صبا کو تو ہمدردی کا موقع ملے کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔

"ہاں، پھوپھو کے بیٹے ڈاکٹر ہیں۔"

"اچھا واقعی! گھر میں ایک ڈاکٹر ہو تو کتنی سہولت ہوتی ہے۔" ممانی بے قرار ہو گئیں۔

"مفت میں علاج ہو جاتا ہے۔ کتنا میں نے چاہا نوید میڈیکل جوائن کرے۔ مجال ہے میری کوئی بات سنی جائے اس گھر میں۔"

ممانی نے از حد قلق کے انداز میں پورے گھر کو لپیٹ لیا۔

لان میں بہت سے پھول کھل اٹھے تھے۔ ہار سنگھار کا پیڑ پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ ہر روز صبح کو اس کے نیچے خوش رنگ، خوشبودار پھول یوں بکھرے ہوتے جیسے یہ ان کے فرائض میں داخل ہو کر سوکھی بدرنگ گھاس کو اپنی پربہار سفید پنکھڑیوں اور گہرے زرد رنگ کی ڈنڈیوں سے ڈھانک دیں اور کسی کو گھاس کی بدنمائی کا احساس تک نہ ہو۔ انجو کو ہار سنگھار کے پھول گھاس پر بکھرے ہوئے اچھے لگے۔ وہ انہیں جھک جھک کر اٹھانے اور دوپٹے میں رکھنے لگی۔ واہ کیا مہک تھی۔

وہ فجر کی نماز پڑھ کر باہر نکل آئی تھی۔ لان کی سبز گھاس پر اوس کے قطرے موتیوں کی طرح دمک رہے تھے۔ کیاری میں کارنیشن بہار دے رہے تھے۔ ہر سمت متوالی سی فضا تھی اور جب وہ گیلی گھاس پر ٹہلتی ہوئی کونے میں آئی جہاں ہار سنگھار کا پیڑ خوشبودار پھولوں سے ڈھکا کھڑا تھا تو زمین پر بچھے پھولوں نے قدم ہی جکڑ لیے۔ کتنی کم عمر ہوتی ہے، اگر شاخوں پر کچھ عرصہ لگے رہیں، تو کتنے دن تک درخت کا سنگھار قائم رہے، لیکن کھلتے ہی گرنے کے عمل سے گزرنے لگتے ہیں۔

گیٹ پر دستک۔ ہائیں اتنی صبح، گھر والے تو سب بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ اس گھر کی صبح تو نو بجے سے پہلے ہوتی نہیں تھی۔ نوید اور معید بھی آرام سے ہی کالج جاتے تھے۔ پتا نہیں کالج میں پڑھنے والے اس قدر بے فکرے کیوں ہوتے ہیں۔ ندا تو ویسے بھی رات دیر تک جاگتی۔ پھر دیر کر کے صبح اٹھنے کے ریکارڈ توڑتی رہتی تھی آئے دن۔ صبا اٹھ جاتی، مگر گھر سے نکلنے کی اسے ضرورت نہ تھی۔ اکیلی اٹھ کر کرتی کیا۔ بس پلنگ پر لیٹی لیٹی دن بھر کا پروگرام بنایا کرتی۔ نوید تو یوں بھی اس وقت جاگتا جب اسے یقین ہو جاتا کہ ایک دو پیریڈ گزر چکے ہیں۔

خانساماں بھی انہی کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اسے جگانے کی ذمہ داری معید کی تھی کیونکہ سعید اور وحید کی آوازیں اور دروازے پر جوتے مکے برسانے کی کوشش بے کار جاتی۔ معید ہی گرجدار آواز میں کھڑکی پر جا کر آواز

دیتا تو وہ اٹھ کر آتا۔ سستی کا ہل، اول درجے کا۔ دستک کی دوسری آواز پر بلا ارادہ ادھر بڑھتی گئی۔ گھنٹی کا سوئچ باہر نہ تھا۔

اخلاق صاحب ان گلی کے شریر بچوں سے عاجز تھے جو بیل بجا بجا کر گھر والوں کو ڈسٹرب کرتے تھے۔ خانساماں نے اپنے کوارٹر کی گھنٹی بھی اسی لیے توڑ دی تھی۔ ڈسٹرب وہ بھی ہوتا تھا اس کی نیند بھی۔

"کون ہے؟"

"آپ گیٹ کھولیں، چور نہیں ہوں میں۔"

"لیکن، کس سے ملنا ہے؟"

"فی الحال تو آپ سے۔"

"جی؟"

"ظاہر ہے پہلی ملاقات آپ سے ہی ممکن ہے۔" آنے والا اب گیٹ کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔

انجو ٹپٹا کر مڑ گئی۔ گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ آنے والا کوئی شریف ہی لگ رہا تھا۔

"میں چابی لاتی ہوں۔"

اس نے مڑ کر گیٹ کو مخاطب کیا۔ اندر جا کر اس نے چابی اتار لی۔

پھر صبا کے کمرے پر دستک دی۔ غنیمت ہے، وہ جاگ رہی تھی۔

"خیریت، اتنی صبح۔" وہ پریشان ہو گئی۔

انجو نے معاملہ گوش گزار کیا۔ اب صبا آگے انجو پیچھے۔ وہ برآمدے میں رک گئی پھر اس نے بے ساختہ صبا کو گیٹ کی طرف دوڑتے دیکھا۔ اس کے ہر انداز میں مسرت بھری تھی۔

"ہائے ماموں آپ!" وہ بے ساختہ گیٹ کی سمت دوڑتی چلی گئی تھی۔ ماتھے پر ہاتھ مار کر واپس پلٹی۔ بھاگتی ہوئی برآمدے میں آئی۔ انجو نے اس کا ارادہ بھانپ کر، ہتھیلی آگے کر دی۔ چابی اچک کر صبا پھر باہر دوڑی۔ انجو اندر آ گئی، اس کی ذمہ داری ختم۔

نانی ابھی سوئی ہوئی تھیں، وہ بھی پلنگ پر لیٹ گئی۔ ہار سنگار کے پھول اس نے سرہانے کی طرف رکھ دیے اور تکیے کے نیچے سے کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔

ناشتا ہو رہا تھا تو ندا کی وہ دوست، بے تکلف اور ذرا اتراتی شکل بلکہ چھچھوری سی ماذا آ گئی اور گو کہ یقیناً ناشتا کر کے آئی ہو گی، مگر آنکھیں پھیلا کر میز پر رکھی چیزوں کا تیزی سے جائزہ لے کر اس نے چھینٹا سا مارا، اور نوید کے سامنے پلیٹ سے آملیٹ اچک کر منہ میں بھر لیا۔

نوید نے غصے اور ناگواری سے کرسی کھسکائی اور بڑبڑاتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔

ماذا کے قہقہے کمرے تک اس کا پیچھا کرتے رہے۔ دھڑ سے دروازہ بند کر کے باتھ روم میں گھس کر وہ بلند آواز میں اس بدتمیز لڑکی کو قسم قسم کے خطابات سے نوازتا رہا۔ اسے یہ لڑکی ذرا پسند نہ تھی۔ انتہائی ــ انتہائی نہ جانے کیا تھی۔

ماذا ــ دیر تک اپنی حرکت پر مسرور رہی، لطف لیتی رہی، اسے اس طرح کے لیے دیے رہنے والے لڑکوں کو پڑ جانا، ان کا غرور توڑنے کا شوق تھا۔ وہ خاصی قبول صورت لڑکی تھی، مگر اسے ابھی تک یہاں تو کامیابی ہوئی نہیں تھی، بلکہ ندا نے اسے بتا دیا تھا کہ بھائی اس کا ماذا سے ملنا پسند نہیں کرتے، جس پر اس نے ندا کی پیٹھ پر دھپا مار کر قہقہہ لگایا تھا۔

نوید باہر نکلا تو گیٹ کے باہر انجو نظر آئی۔ وہ اپنی اسی سفری چھینٹ کی چادر میں ملبوس بلکہ ملفوف تھی اور شاید کسی سواری کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ (تانگے تو یہاں ملنے سے رہے) نوید نے سوچا جا رہی ہو گی اپنی پھپھو کے گھر۔ نہ جانے کس محلے میں ہے ان کا گھر کہ جہاں تانگے کے سوا اور کوئی سواری ملتی ہی نہیں۔

بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے از راہِ اخلاق پوچھ لیا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے۔ آپ کو ناگوار نہ ہو تو میں۔"

وہ مڑی تو نوید نے دیکھا۔ اس کا پورا چہرا سوائے آنکھوں کے چادر میں پوشیدہ تھا اور اس کی آنکھیں وہ سیاہ خوبصورت، کچھ بولتی ہوئی آنکھیں، جن کی چمک میں عجب قسم کی دلکشی تھی۔ آدمی کو ہرا دینے والی، جھٹکا دینے والی، تھکا دینے والی۔ وہ جادوگر آنکھیں، جلا

کر راکھ کر دینے والی۔

"جی، اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔۔۔!" وہ بولی تو چادر کے اندر سے اُس کی آواز تھرتھرائی ہوئی تھی، عجب آواز ہے اور عجیب آنکھیں، چہرے کے ساتھ دیکھو تو قطعی سادہ اور غیر دلچسپ اور چہرے سے الگ، چمکتی دمکتی روشنی کا آبشار۔

"آئیے۔" وہ قدرے بے زاری سے بولا۔ اب جانے کہاں کہاں گلیوں کی خاک چھاننی پڑے گی۔

"بیٹھیے۔" اخلاق کر چکا تھا۔ نبھانا تو تھا۔

ماموں احتشام، صبا کی امی کے رشتے میں چچازاد بھائی ہوتے تھے۔ ان کو سروس مل گئی تھی، گھر بھی ملا تھا، مگر جب تک دفتر جا کر اپنے عہدے کا چارج نہ لیں، مکان کا قبضہ نہیں مل سکتا، اس لیے وہ اپنی چچازاد بہن کے گھر آ گئے۔ جن کے بچے بہت بے تکلف اور خاصے ایڈوانس تھے۔ سب بے حد بااخلاق اور محبت کرنے والے تھے۔

آپا جان، جن کو خالہ جان کہنے میں بھی حرج نہ تھا کہ عمر کے لحاظ سے وہ خالہ ہی لگتی تھیں، مگر تھیں بڑی بدنفس، نکتہ چیں اور معترض اور جنہیں اپنی مالی حالت کے پتلے پن کے سوا کوئی بات نہ سوجھتی۔ حالانکہ صاف ظاہر تھا کہ دولت ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ آپا جان کے چھپانے کے باوجود۔

"تو خیر سے کہاں لگی تمہاری نوکری؟" مکان ملنے کا معلوم ہوتے ہی ان کا لہجہ خاصا شہد آگیں ہو گیا۔ اس نے بتا دیا۔

"واہ بھئی، ایک ہمارے نوید میاں ہیں، جنہیں کہیں نوکری ہی نہیں ملتی۔"

"مگر وہ تو ابھی پڑھ رہے ہیں، ایم بی اے کر رہے ہیں سنا ہے۔"

"بس سنتے رہو، ہم بھی سنتے رہتے ہیں، اور کیا نوکری کے ساتھ نہیں ہو سکتی پڑھائی۔"

وہ نوید سے خاصی خفا لگیں۔ بھلا نوید پر ایسا کون سا وقت آ پڑا تھا کہ نوکری اور پڑھائی ساتھ ساتھ کرتا، مگر ماں کے منہ سے یہ بات سن کر وہ خاصا حیران ہوا تھا۔

نوید آیا تو ماموں سے یوں لپٹا جیسے برسوں کا بچھڑا محبوب۔

شام تک نوید کے دوست بھی آ گئے اور پھر جو قہقہوں کا طوفان کمرے سے اٹھا تو پورے گھر پر محیط ہو گیا۔

اُن کی آوازوں سے دادی بے آرام ہو رہی تھیں مگر دوستوں کی موجودگی میں تو کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔ نوید کو بہت غصہ آتا تھا اور وہ زور زور سے چلاتا تھا۔ ویسے وہ بہت نرم سبھاؤ کا سیدھا سادہ، نجانے کس قسم کا لڑکا تھا، مگر دوستوں میں تو اس کی جان تھی۔ ان پر اعتراض گویا اس کی جان پر حملہ تھا سوائے صبا کے، جو اس پر اعتراض ہی نہیں کرتی تھی بلکہ اس کے دوستوں کو ڈانٹ بھی دیتی تھی اور وہ سب نظریں چرا کر مسکراتے اور کوئی کوئی تو ہاتھ جوڑ کر معافی بھی طلب کر لیتا۔ اس حرکت پر صبا کو ہنسی آ جاتی اور وہ مسکراہٹ چھپا کر ادھر اُدھر ٹل جاتی۔

سہ پہر کو انجوہ آئی تو خاصی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔۔۔ دادی نے حیرت سے دیکھا۔

"ایں۔۔۔ تم فرخندہ کے گھر نہیں گئیں؟"

"پھپھو کے ہاں۔۔۔ نہیں تو، نانی! دراصل مجھے۔۔۔ میں آپ کو بتا کر تو گئی تھی کہ آ جاؤں گی۔"

"ہاں، اچھا! مگر گئی کہاں تھیں؟"

"میری ایک سہیلی ہے یہاں، اُس نے بلایا تھا۔ نانی اُس کی امی کو عجیب سی بیماری ہو گئی ہے۔ انہیں ہچکیوں کی بیماری ہو گئی ہے اور وہ کسی بھی مہمان کو دیکھ کر ہنستی ہیں تو ہنستی ہی جاتی ہیں۔ یہ کیسی بیماری ہے، ہچکیاں اور ساتھ ساتھ ہنسی۔"

"اے ہے۔" دادی فوراً اُٹھ کر بیٹھیں۔

"ہچکیوں کی تو خیر پرانی بیماری ہے، حکیموں کے پاس ہے اس کا علاج، مگر ہنسنے کی بیماری، توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ یہ تو مالیخولیا ہے، اللہ بچائے۔ کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کروائے۔"

بیماری دادی کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ہزاروں بیماریاں اُن کی یادداشت میں محفوظ تھیں۔ انہوں نے چند

مشہور ڈاکٹروں کے نام بتائے، جو کبھی ان کے بھی معالج رہ چکے تھے۔

"جی اچھا، کل جاؤں گی تو اُسے بتا دوں گی۔"

"کل پھر جاؤ گی؟"

"جی، اکیلی ہے ناں بے چاری، بہت پریشان ہے بھائی بھی باہر گئے ہوئے ہیں، ذرا تسلی ہو جاتی ہے۔ نانی آپ چلیں گی؟"

اور دادی کو فوراً اپنے گھٹنوں کے درد، سر کے بھاری پن کا خیال آ گیا۔ وہ کراہنے لگیں۔

اُسی شام ماذا پھر آ گئی۔ اُس نے ماموں کے ساتھ ٹینس کھیلی۔ ماموں، معید اور ندا کے ساتھ کیرم کی بازی لگائی۔ رات ہو گئی تو نوید سے اُس نے کہا۔

"مجھے چھوڑ کر آئیں۔ اب رات میں اکیلی کیسے جاؤں گی۔"

نوید کو غصہ آ گیا۔ "نہ میں نے تمہیں بلایا، نہ روکا، نہ ہی رات کا ذمہ دار ہوں۔"

ماموں اُسے چھوڑنے گئے۔ اس پر بھی نوید کو اعتراض ہوا اور امی نے اس سے اتفاق کیا۔

آخر وہ بھی بیٹیوں والی تھیں۔ پھر یہ کہ احتشام ان کا عزیز تھا اور ماذا بڑی چالاک، تیز طرار تھی۔ بے حد ایڈوانس اور بے باک۔ پتا نہیں اس کے والدین نے اسے آزاد کیوں چھوڑا تھا، مگر وہ اس کے والدین پر اعتراض نہیں کر سکتی تھیں، بس ندا کو ڈانٹتی تھیں۔

"کیوں اس فتنی سے دوستی کی ہے، جان ہی نہیں چھوڑتی چڑیل۔"

فجر کی نماز کے لیے اُس نے نانی کو جگایا، مگر ان کی نیند بہت گہری تھی، اس لیے خود نماز سے فارغ ہو کر دوبارہ جگایا۔

"ہاں، ہاں جاگ گئی ہوں۔"

"نانی! وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

"ہاں، ہاں بیٹی اچھا!" وہ ہوشیار ہو کر دوپٹا ٹٹولنے لگیں۔

اور وہ پچھلے سے باہر نکل آئی۔ دھندلا، ملگجا اُجالا، آسمان پر دو ننھے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہلکی ہلکی خنکی خوشگوار سی نمی فضا میں موجود تھی اور ملگجے اُجالے میں پھولوں کے مکھڑے چمک رہے تھے۔ گھاس دُھلی دھلی سبز سبز تھی۔ انجو نے سر اُٹھا کر لمبے لمبے سانس لیے۔ وہ کارنیشن کی مہک اور ہار سنگھار کے پھولوں کی خوشبو۔ ہار سنگھار کے پھول آج بھی گھاس پر بچھے ہوئے تھے، زمین پر جیسے ایک قالین دلکش، سفید اور زعفرانی رنگ کا قالین۔

وہ پیڑ کے نیچے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک سرخوشی کے سے عالم میں اُس نے شاخ ہلائی سر۔۔۔ سر۔۔۔ سر گرتے کتنے پھول اُس کے اُوپر برس پڑے۔ بالوں پر، شانوں پر جھولی میں آن گرے، شانوں پر اٹک گئے۔ کان پر سے اس نے وہ ہلکا پھلکا پھول اُٹھا کر ناک سے لگایا۔ تر و تازہ، خوشبودار، گدگدی سی ہونے لگی، ہنسی آنے لگی۔ آنکھیں بند کر کے سر اُٹھا کر اس نے پھر شاخ ہلائی اور ہنسی پھر سر نیچا کر کے آنکھیں کھولیں تو ہر سمت اُجالا پھیل چکا تھا، ہر چیز اُجاگر ہو گئی تھی۔ آسمان روشن تھا ستارے غائب، پھول ہنس رہے تھے، ہوا چل پڑی تھی۔ اُس نے جھک کر سارے زرد ڈنڈی اور سفید پنکھڑیوں والے نازک، نفیس پھول ایک ایک کر کے چننے اور اپنی جھولی میں ڈالنے لگی۔ اس کے سفید دوپٹے کی جھولی بھر گئی مگر ویسی ہی ہلکی تھی، جیسے خالی ہو۔

وہ اُٹھی تو چیخ نکل گئی۔ کسی کا سایہ تھا، کسی کی موجودگی کا ادراک تھا، نہیں وہ تو خود تھا۔ وہ کل آنے والا مہمان اور وہ دونوں یوں آمنے سامنے کھڑے تھے، جیسے مدت سے شام ازل نے انہیں اسی طرح کھڑا کیا ہوا ہو۔ وہ منہ اُٹھائے کچھ حیرت، کچھ گھبراہٹ سے اُسے دیکھ رہی تھی اور آس پاس کے منظر سے قطعاً لاعلم۔ اُسے پتا نہ تھا کہ اس کے سر سے دوپٹا ہٹ گیا ہے اور سیاہ بالوں کے بیچ چمکتی، وہ سفید مانگ جس پر کسی کہکشاں کا گماں ہوتا تھا۔ اور جس پر ایک زرد ڈنڈی اور سفید پنکھڑی کا پھول ابھی ابھی ٹپک کر اس کہکشاں کے درمیان چپک گیا تھا، جیسے کسی شاہراہ پر کوئی ضدی بچہ مچل کر بیٹھ جائے۔

مجھے یہ لینا ہے، مجھے وہ لینا ہے۔

اور اُسے تو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کب ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور دوپٹے کی بھری جھولی کے پھول کسی آبشار کی مانند زمین پر جا گرے ہیں۔ کچھ اس کے قدموں پر۔ کچھ مہمان کے جوتوں پر اور کچھ گھاس پر چاندنی کی مانند چھٹک گئے۔ نہ جانے وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں کیا کھوج رہے تھے۔ گزرتی ہوئی کل کی کھوئی ہوئی کوئی داستان یا آنے والے دنوں کی روشن راہیں، یا وہ کچھ دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔ بس ایک دوسرے کو پہچان رہے تھے۔

پھر اُس نے انجو کی کہکشاں جیسی چمکتی مانگ پر سے وہ ضدی بچے جیسی خصوصیت کے اس پھول کو اپنی دو انگلیوں کی چٹکی سے پکڑ کر اُٹھا لیا، جیسے تتلی کو پروں سے زمی سے پکڑ لیتے ہیں یا جیسے کسی ستارے کو چھو لیا ہو، پھر وہ پھول عین انجو کے سامنے ایک روشن پھلجھڑی کی طرح دمکا اور نیچے گر گیا۔

انجو کے بند لب ذرا سے کھلے اور وہ فوراً ہوش میں آ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے بھاگتی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دوپٹے کا کونا احتشام کے جوگرز تلے دبا ہوا ہے۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں احتشام کی نگاہ بھی ادھر گئی اور اُس نے پھر بھی آنچل پر سے پیر نہیں ہٹایا، بلکہ انگلی کے اشارے سے پھولوں کی طرف توجہ دلائی۔

"اوہ، سارے پھول گر گئے، آؤ انہیں اُٹھاتے ہیں۔"

وہ اکڑوں بیٹھ گیا اور پھول چننے لگا۔ اُسے بھی پھول اُٹھانے پڑے۔ وہ زرد ڈنڈی اور سفید پنکھڑیوں والے پھول، اور جن کی نازک پنکھڑیاں مردانہ انگلیوں کی گرفت سے کملا رہی تھیں۔ وہ بڑی تیز اور شائستگی سے ایک ایک پھول چن رہا تھا اور اُس کے دوپٹے کی جھولی میں ڈال رہا تھا۔

اور اُس نے ان پھولوں سے زیادہ پھول اکٹھے کر لیے تھے، جتنے انجو کی جھولی سے گرے تھے۔ پھر وہ ہاتھ جھاڑتا کھڑا ہو گیا۔ انجو بھی کھڑی ہو گئی۔ وہ منتظر تھی کہ اس کے دوپٹے کو کب رہائی ملے گی اور وہ یہاں سے بھاگ پڑے گی، مگر وہ تو مزید دباؤ ڈال کر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے پیڑ کی شاخ ہلائی۔ سر۔ سر۔ سر پھول ان پر برسنے لگے، جیسے ستاروں کی بارش ہو رہی ہو۔ وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

"اوہ! بڑا مزا آ رہا ہے، گدگدی ہو رہی ہے۔ کیا واقعی تم اسی لیے ہنس رہی تھیں۔ میں جوگنگ کے لیے نکلا تو تمہیں یہاں کھڑا دیکھا۔"

اُس نے ایک بھرپور نظر انجو پر ڈالی، اس کے سر، شانوں اور دوپٹے پر پھول گر کر چپک گئے تھے، اور وہ صرف احتشام کے جوتوں کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے نیچے اس کا آنچل دبا ہوا تھا۔

"تم نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں اور سر اُٹھائے کھڑی ہنس رہی تھیں اور پھول تم پر برس رہے تھے اور یہ منظر میرے دل میں کھب کر رہ گیا تھا۔ میں نے کبھی ایسا سین نہیں دیکھا تھا۔ کسی فلم میں بھی نہیں۔ تم مجھے اس وقت بہت اچھی لگیں۔ اب تم کو ہنسی کیوں نہیں آتی؟"

"کیونکہ میرا دوپٹا آپ نے اپنے جوتے کے نیچے دبا رکھا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ سوری بھئی۔ کیسا عجب اتفاق ہے کہ ایسا سین بھی میں نے کبھی کسی فلم میں نہیں دیکھا۔"

شرارت اُس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور انجو نے کھٹ بھاگنے کی ٹھانی۔ وہ دوڑتی چلی گئی اور سارے لان پر ان خوبصورت پھولوں کی لکیر سی بنتی گئی۔

ایک شاہراہ تعمیر ہوتی گئی۔

ایک تقدیر رقم ہوتی گئی۔

اُس کے دوپٹے کی جھولی بڑی ہی کم ظرف تھی جو اُن پھولوں کا بوجھ نہ سہار سکی۔ کتنی وزنی لگی تھی اُسے پھولوں بھری جھولی۔ تبھی سارے پھول جھولی سے سرکتے گئے یہاں سے وہاں تک لان پر بکھرتے گئے اور ایک شاہراہ بناتے گئے۔

وہ زرد ڈنڈی اور سفید پنکھڑیوں کے پھول، جو بے حد نازک اور بے حد حسین تھے، بہت دلکش اور نفیس اور آگے آگے دوڑتی بھاگتی وہ سفید کپڑوں والی لڑکی بھی ایسی ہی تھی، حسین نازک، دلکش اور نفیس۔

احتشام بڑے شوق اور تعجب سے اس منظر کو دیکھتا رہا۔ پھول والی لڑکی، نہیں، صرف پھول والی۔

کیا حسین نظارے آج دیکھنے کو ملے۔

دیر سے اُٹھنے والے ان مناظر سے محروم رہتے ہیں۔ سورج نکلنے کا منظر، آسمان سے اچانک صبح کے ستاروں کی گمشدگی اور پھولوں کی بارش کے مناظر۔ اس نے طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھا اور ورزش شروع کر دی۔ اندر تک ایک سکون اور آسودگی تیر گئی تھی۔

انجو کمرے میں آئی۔ تو نانی ابھی تک اسی پوزیشن میں سوئی ملیں۔ ایک ہاتھ سے دوپٹا ٹٹولتی ہوئی پھر سے سو گئی تھیں۔ وہ بستر پر بیٹھی تو اُس کا دل ابھی تک بے قابو تھا۔ دھک۔ دھک۔ کیسی صبح تھی یہ، انجانی سہانی، مگر ہائے اُس نے دوپٹا دیکھا، کہیں ایک پھول تک نہیں، سب پھینک آئی اور اب تو اُن کی مہک بھی دوپٹے سے اُڑ چکی تھی۔ ملال کی سی کیفیت میں وہ بیٹھی رہ گئی۔ سرہانے کتاب ویسے ہی پڑی رہی اور وہ ٹھوڑی ہاتھ پر ٹکائے سوچ میں گم رہی۔

اتنے ڈھیر پھول کہتے ہیں پھول خوش قسمتی کے ضامن ہوتے ہیں، لیکن اپنے ہاتھوں سارے پھول گنوا آئی، اور ایک پھول بھی تو باقی نہ بچا کہ مہک سے دل دماغ معطر رہتے۔

سارا دن وہ بے چین رہی اور دو بڑی بڑی شربتی آنکھیں حیرانی سے بھری آنکھیں تصور میں آ کر اودھم مچاتی رہیں۔ گھبرا کر وہ پھپھو کے ہاں چلی گئی اور شام تک احتشام اندر باہر جانے کیا کھوجتا رہا۔ نوید آیا تو سیدھا دادی کے کمرے میں گھس کر ادھر اُدھر کی ہانکنے لگا۔

"ارے ہاں دادی! وہ آپ کی پینڈو نواسی ڈاکٹرنی کہاں ہے، نظر نہیں آ رہی، ذرا چائے والے ہی بنا دیتی ہے تو پینڈو، مگر چائے کلاس کی بناتی ہے۔"

اور دادی نے اُس کی سہیلی کی ماں کی پوری داستان مزید حاشیے کے ساتھ نوید کے گوش گزار کر دی۔

"صاف مالیخولیا ہے، پریشان ہے بے چاری۔"

"کون، آپ کی نواسی؟"

"نہیں اُس کی سہیلی، وہیں تو گئی ہے انجو۔"

"مگر اُس نے مجھے تو نہیں بتایا۔"

"تمہیں؟ کیا؟"

"میرا مطلب ہے آخر مجھے کیوں نہیں علم اس بیماری کا۔ کہانی تو سُنی ہے ہنسنے رونے والے شہزادے کی۔ خیر میں اُسے ڈاکٹروں کے پتے ہی بتا دیتا۔"

"ارے یہ دیہاتی لوگ کب قائل ہوتے ہیں ڈاکٹروں کے۔"

"ہاں، خود جو آدھے ڈاکٹر ہوتے ہیں خطرۂ جان۔"

وہ بڑبڑاتا اندر آیا، پھر دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کو نکل گیا۔

شام کو ماذا آئی تو بہت بے مزا ہوئی۔ احتشام بھی نہیں تھا۔ رات تک وہ انتظار کرتی رہی، پھر گھر فون کر کے گاڑی منگائی اور چلی گئی۔

"مجھے اس لڑکی کے لچھن کچھ ٹھیک نظر نہیں آتے" صبا کی امی نے سرگوشی میں یہ بات کی تھی، مگر اُن کی آواز لاؤنج میں بھی سُنی گئی، جہاں نوید اور احتشام بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔

"ارے یہی لڑکی، انجو اور کون، جانے کہاں جاتی ہے؟"

"میں سمجھی آپ ماذا کی بات کر رہی ہیں۔" صبا نے حیرت سے کہا۔

"ماذا کا ہمیں پتا تو ہے ناں، آزاد اور دل کھلی ہے، مگر یہ انجو، دیہاتی اور جاہل، اور پھر ہمارے گھر آتی ہے۔ تو ہم کو خبر رکھنی چاہیے۔ آخر ہماری بھی ذمہ داری ہے۔"

"ہماری ذمہ داری؟ کیوں؟ ہم تو اسے نہیں بلاتے، خود ہی آتی ہے۔ جہاں چاہے جائے، جہاں مرضی رہے۔"

"واہ! گاؤں دیہات کی رہنے والی شہر کی سڑکوں، راستوں سے ناواقف، کل کلاں کچھ ہو جائے تو اس کے ماں باپ ہم سے ہی پوچھیں گے۔"

"کیا پوچھیں گے؟" نوید دروازے پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"یہی کہ آخر جاتی کہاں ہے پتا تو چلے، اتنی لاپروائی بھی اچھی نہیں۔ بہت سے سوال ہوتے ہیں اور ہم کسی کو جواب نہ دے سکے تو۔ کون یقین کرے گا کہ اس کی آمدورفت کا ہم کو علم ہی نہیں۔ جوان لڑکی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔"

"امی! آپ فکر نہ کریں، وہ کہاں جاتی ہے، کیا کرتی

ہے، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ وہ نا سمجھ ہے نہ نادان، بلکہ خاصی عقل مند ہے۔" نوید لاپروائی سے بولا۔

"اور اس کے والدین کو اس پر بھروسا ہے۔"

"ارے واہ! تم کیا جانو، یہ دنیا بہت خراب ہے اور ایسے چپ چاپ پُراسرار لوگ، خطرناک ہوتے ہیں، ہمیں کیا پتا وہ اپنی پھوپھو کے گھر جاتی بھی ہے کہ کہیں اور ـــ"

"اور وہ جو تانگہ آتا ہے۔" نوید نے مضحکہ اڑانے کے انداز میں کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

احتشام کے کان بھی اسی طرف لگے ہوئے تھے۔ پوچھنے لگا۔

"کیا مسئلہ ہے، کیا کوئی شک ہے کیریکٹر ـــ" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ نوید نے ہاتھ ہلایا۔

"ارے نہیں، کوئی مسئلہ نہیں، امی کو یونہی فکر ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ جو ماذا صاحبہ آتی ہیں، یہ میری سمجھ سے قاصر ہیں۔"

"بہت زیادہ ایڈوانس ہے، ان معنوں میں کہہ رہے ہو۔"

"ایڈوانس تو سبھی ہوتے ہیں، لیکن ماحول بھی کچھ سکھاتا ہے اور یہ لڑکوں سے فوراً فری ہو جانا، اچھے نتیجے نہیں نکلتے۔ زیادہ تر تو یہ صاحبہ ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں اور آپ کو پتا ہے کہ لڑکے بعض دفعہ غلط معنی لے لیتے ہیں بے تکلفی کے۔"

"ہاں مگر جیسا کہ تم نے اپنی کزن کے بارے میں کہا، اسی طرح اس لڑکی ماذا کے والدین کو بھی اس پر بھروسا ہوگا جبھی وہ دوسروں کے گھر زیادہ پائی جاتی ہے۔"

"میرا مطلب ہے لڑکیوں کو اور نہیں ہونا چاہیے۔ دراصل میں بھی بہنوں کا بھائی ہوں اس معاملے میں زیادہ حساس ہوں۔ میں تو ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ کوئی لڑکا یا لڑکے میری بہنوں کے بارے میں تبصرے کریں، جیسے کہ ہم نے ماذا کو موضوع گفتگو بنایا ہوا ہے۔"

"لیکن، تمہارے ہاں لڑکوں کی آمد پر کوئی پابندی تو نہیں۔ وہ الگ بیٹھ کر کیا باتیں کرتے ہیں، تمہیں کیسے خبر ہو سکتی ہے۔ تمہارے دوست بھی آخر اسی معاشرے کے فرد ہیں۔"

"میں دوستی کے معاملے میں خاصا متعصب ہوں۔ بہت خاص آزمائے ہوؤں کو گھر آنے کی اجازت ہے میرا کوئی دوست کمینہ نہیں، نظرباز نہیں۔"

"کمینے اور نظرباز تو ہم بھی نہیں، پھر اس لڑکی ماذا کو کیوں موضوع گفتگو بنا رہے تھے۔ وہ کہیں جائے، کچھ کرے، ہمیں کیا۔ وہ خود یا اس کے والدین اس کے ذمہ دار ہیں۔"

"بالکل درست۔ میرے کہنے کا مطلب ہے لڑکی ایسی حرکت کرے کیوں کہ اسے دوسرے موضوع بنائیں۔ یہاں وہ لڑکی بھی تو ہے۔ اسے کیوں نہیں ہم گفتگو میں لاتے۔ اچھا چھوڑیں یہ ذکر، چلیں کیرم کی بازی لگاتے ہیں۔"

احتشام سوچ میں گم ہو گیا۔ ہاں اسے ہم گفتگو میں نہیں لاتے۔ شاید اس لیے کہ اسے کسی قابل نہیں سمجھتے اور میرے لیے وہ عزیز ہے یا طلوع آفتاب کے منظر کی طرح مقدس اور تازہ پھول کی طرح پاکیزہ، اور کوئی ان کی پاکیزگی کے نمونوں پر اعتراض کے پتھر نہیں چلاتا۔

احتشام کو گھر کا قبضہ مل گیا تھا۔ اس نے سب کو گھر دکھانے کی پیشکش کی۔ سب تیار ہو گئے مع ماذا کے۔ گھر کافی دور تھا۔ دو بیڈ روم کا مختصر سا بنگلہ تھا۔ تھوڑا سا فرنیچر بھی تھا۔

ماذا نے ناک چڑھائی۔

"ہوں ہوں، اتنا کم فرنیچر اور کتنا پرانا۔"

ندا نے بھی اس کی نقل میں ناک چڑھالی۔

صبا نے کہا۔ "واہ! ضرورت کا سب سامان تو ہے، پھر شادی کریں گے تو جہیز کا سامان آجائے گا گھر سج جائے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" ماذا بولی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" ندا نے فوراً کہا۔

"ماموں جلدی سے کریں شادی۔"

ماذا اُمید آس بھری نظروں سے احتشام کو دیکھنے لگی۔

احتشام ہنس دیا۔

"بھئی جہیز تو لینے کا قائل نہیں ہوں میں۔ کوئی اپاہج ہوں نکما۔ جو کچھ حاصل کروں گا اپنے دست بازو کی کمائی سے، کیا سمجھیں؟" اس نے ندا کے سر پر ٹھونگ لگائی۔

"سمجھ گئی۔ آپ کسی غریب غرباء سے شادی کریں گے تو جہیز لے کر نہ آئے۔" ندا منہ بنا کر بال درست کرنے لگی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے بچہ۔" امی نے جھٹ احتشام کی تائید کی۔

"جہیز ساری عمر کام نہیں آتا۔"

واپس آئے تو دادی نے کرید کرید کر سب حال پوچھا۔

"تو بیٹا اب تم خیر سے اپنے گھر چلے جاؤ گے۔"

"جی دادی۔" اس نے اُداس ہو کر کہا۔

وہ اپنے بھانجے بھانجیوں کی نقل میں ان کی دادی کو دادی ہی کہتا تھا۔ دراصل اسے پتا ہی نہ تھا کہ بہن کی ساس کو کیا کہنا چاہیے۔ خاص طور پر جو بہن خالہ جیسی ہو اور اس کی ساس دادی یا نانی جیسی۔

"اپنی ماں کو بلا لو، اکیلے کیسے رہو گے۔" دادی مفت مشورے دینے میں ماہر تھیں۔

"جی اور مجھے تو چائے تک بنانی نہیں آتی، کھانا کیسے پکاؤں گا۔" اس نے دزدیدہ نظر دادی کے عقب میں بیٹھی چادر پوش الجھو پر ڈالی۔

"ارے اب تم کیا کھانا بھی پکاؤ گے۔" آپا جان لاڈ سے بولیں۔

"یہیں آکر کھا لیا کرنا۔"

"نہیں جی، اتنی دور سے۔ سارا وقت آنے جانے کھانے پینے میں خرچ ہو جائے گا، دفتر کا کام کون کرے گا۔"

صبا بہت دور اندیش اور فرض شناس لڑکی تھی۔

"تو پھر چچا جان کے آنے تک تم یہیں رہو۔ کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے وانے کی۔" آپا جان نے حتمی انداز میں کہا۔

"خالی گھر شیطان کا بسیرا۔" انہوں نے آخر میں محاورہ فٹ کیا اور وہ ٹھٹک گیا۔

دراصل وہ اتنی بھی مہمان نواز نہ تھیں، مگر دادی نے ان کو اکسایا تھا کہ اسے اپنے سے قریب کرو۔ لڑکی والی ہو اور یہ لڑکا نہ صرف کہ تمہارا عزیز ہے، بلکہ ہر لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔ صورت شکل، خاندان، تعلیم عمدہ۔ کوئی کمی تو نہیں ہے۔ بس دولت نہیں ہے۔ یتیم بچے کو ماں نے اپنی جوانی کی امنگوں کا خون پلا کر پالا تھا۔ بیوہ عورت نے اپنی محنت سے بیٹے کو پرورش کیا، اس کی رگوں میں عزت نفس اور خودداری کا لہو ہے۔ بے نفس بے غرض ایسے لڑکے اب کہاں ملتے ہیں۔ اور اُن کی سمجھ میں بھی آ گیا۔

صبا تو یوں بھی بُک ہو چکی تھی۔ گوکہ باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی، مگر دادی نے بڑے بیٹے سے کہہ رکھا تھا بہو کی تلاش نہ کریں۔ اس گھر میں وہ لڑکی موجود ہے، جو تمہارے گھر میں آجائے بھر دے گی۔ اتنی نیک سرشت لڑکی غیروں میں نہیں دی جا سکتی۔

چچا جان کو تو اعتراض نہ تھا، مگر ان کا بیٹا امریکہ جا کر بیٹھا تو آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس کے انتظار میں کب تک لڑکی کو بٹھایا جا سکتا ہے۔

ندا کے لیے احتشام والی تجویز ان کو پسند آئی۔ اور اب اس نقطہ نظر سے انہوں نے احتشام کو دیکھا تو وہ اور اچھا لگا۔ سجاد کے ساتھ تو کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس کے ساتھ باپ کی نظر افروز دولت ہی نہیں۔ امریکہ کی تعلیم، امریکن ڈالر بھی تھے۔ صبا کے مقابلے میں ندا سیر و تفریح کی شائق، فیشن کی دلدادہ اور شوخ تھی۔ احتشام سنجیدہ سا تھا اور یہ سنجیدگی اس کے حالات کی بخشی ہوئی تھی، اور اخلاق صاحب کے موڈ کا بھی پتا نہ تھا۔ وہ اُن کے میکے والوں کو کب گردانتے تھے۔

اس کا ایک ہی حل انہیں نظر آیا۔ انہوں نے ندا کے سامنے احتشام کی تعریفیں کر کے اس کے بے ریا دل پر احتشام کی چھاپ لگا دی۔

"امی کو پسند ہے تو وہ یقیناً کوئی اعلا کوالٹی کا ہے۔"

اُسے بھی وہ اچھا لگنے لگا۔

مگر ماذا، احتشام کی بے مروتی، بے رخی کے باوجود اس کے جی کا جنجال بنی ہوئی تھی۔

"عجیب ڈھیٹ چیز ہے۔" احتشام بور ہو کر سوچتا۔

صبا تو خیر تھی ہی با وقار، بردبار، مگر ندا تک کو ماذا کی اوچھی حرکت ناگوار گزرنے لگتیں، شاید اس لیے کہ اس کی حرکتوں کا ہدف احتشام تھا۔ خود ندا کو آگے

بڑھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ یہ تو نسوانی وقار کے منافی تھا اگر کبھی وہ اظہار بھی کر دے اور وہ کہہ دیں۔

"سوری"۔ یا کہہ دیں"۔ میں ماذا کو پسند کرنے لگا ہوں" اور ماذا کس کو پسند نہیں۔ نوید کے سارے دوست اس کو پسند کرتے تھے۔ جنہیں بھتی دیتے سنورنے کا گُر آتا تھا (اُسے) طرار بھتی، شوخ اور آزاد منش اور اگر وہ کہہ دیں۔

"میں تو انجو کو پسند کرتا ہوں"۔ تو کیا عزت رہ جائے گی۔ اُسے یونہی سا شک ہوا تھا کہ وہ انجو کی موجودگی میں دادی کے کمرے میں جا کر بیٹھتے ہیں اور اُسے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ وہ انجو میں دلچسپی لیں، کیا ہے اس میں معمولی سی ہے کپڑے بھی فیشن ایبل نہیں ہوتے۔ میک اپ کا اسے علم نہیں، بس کام کرتی رہتی ہے کوئی نہ کوئی۔ بولتی بھی نہیں۔

اور احتشام، جب بھی وہ انہیں دیکھتی مرعوب ہو جاتی۔ بلند پیشانی پر بالوں کا ہجوم، شربتی آنکھوں میں تیرتی مسکراہٹ، دلکش خدوخال۔ کسی دوسری دُنیا میں لے جاتے۔ ہونہہ، انجو ان کے قابل ہرگز نہیں ہے۔ اُسے حیرت ہوتی کہ پہلے جب بھی وہ آتے ان میں کوئی کشش کیوں نہیں محسوس ہوئی۔ شاید امی کی مرضی کے مطابق اور اس نے ابھی تک ان کے اشاروں پر ہی چلنا سیکھا تھا، لیکن اب جبکہ ماذا اپنے حقوق کی چادر لیے احتشام کی طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ دل تھا کہ اسی کا الاپ کیے جا رہا تھا۔

اور اُس شام ماذا نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا کہ وہ احتشام کو چاہتی ہے، اس کے بغیر زندگی بےکار ہے۔

"پلیز ندا! اُن سے کہو اپنی امی کو ہمارے گھر بھیجیں"۔

"واہ! یہ فرمائشی پروگرام بھی خوب ہے۔ میں کیوں کہوں، وہ چاہیں گے تو بھیجیں گے اور ویسے بھی وہ ابھی آئی نہیں ہیں"۔

"تو اُن سے کہو جلدی سے بلائیں۔ میرے لیے کئی جگہ سے اسٹرانگ قسم کے رشتے آئے ہیں"۔

"کیا انہوں نے کبھی تم سے ایسی کوئی بات کی؟"

"نہ۔ نہیں کی، مگر انہیں کرنا پڑے گا"۔

"ممکن ہے، ان کا ایسا ارادہ ہی نہ ہو، تم ہی اُن کی طرف بڑھ رہی ہو"۔

"ایک لڑکی کا آگے بڑھنا، کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ اُس نے اپنی انا کا بوجھ اتار کر اس کشکول میں ڈال لیا ہے، جس میں اُس کی تمام دولت ہے۔ زندگی، محبت، مروت، خودداری"۔

"کشکول لے جا کر اپنی انا اور خودداری کا سودا کرو گی"۔

"اس کشکول میں کچھ لینے کے لیے ہی نہیں دینے کے لیے بھی بہت کچھ ہے"۔

"سب یک طرفہ کارروائی"۔ ندا منہ بنا کر رہ گئی۔

"اگر انہوں نے کہہ دیا معاف کرو بابا"۔

"تو پھر جان دے کر اپناؤں گی۔ ہاں دے دوں گی جان"۔

"محاورہ۔ جان دے کر کس طرح اپناؤ گی، فضول باتیں مت کرو"۔

اور ماذا اس سے خفا ہو گئی۔ دوست ہو کر اس کی ذرا جو حمایت کی ہو اُس نے۔

"اچھا ماذا بندی! پھر جو کرنا ہے تجھے ہی کرنا ہے"۔ اُس نے خود سے کہا۔

ضدی وہ تھی۔ ساری زندگی من پسند چیزوں کے حصول میں کامیاب رہی تھی۔

ہارنا سیکھا ہی نہ تھا۔ لیکن اس بار۔ من پسند چیز نہیں، جیتی جاگتی ہستی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے علم نہ تھا کہ اس ضدی ہٹ دھرم ہستی کی قیمت کیا ہے۔ وہ تو اس کے حصول میں اپنی ہستی کو گروی رکھنے پر تیار تھی اور یہ بھی معلوم کرنا ضروری تھا کہ اس ہستی کی صحیح قیمت لگانے میں کوئی چوک نہ ہو جائے۔ تو۔ پتا چلنا چاہیے کہ یہاں دکھاوا کتنا ہے اور گہرائی کتنی ہے۔

آج کتنے دن کے بعد انجو نے لان میں قدم رکھتے ڈرتے ڈرتے۔ وہ تو کافی دن سے پھپھو کے ہاں ہی تھی، کسی دن آ جاتی تھی۔ اور ہر بار احتشام کو وہیں ڈٹے پا کر خود ہی گھبرا جاتی۔ اور چلی جاتی تھی۔ احتشام نے اسے کوئی خواب نہیں دکھائے۔ کوئی سوال نہیں کیا۔ کوئی وعدہ بھی نہیں کیا۔ بس اسے ڈرا دیا تھا۔ اور وہ اس ناساختہ ڈر سے پریشان ہو جاتی تھی۔ وہ کمزور نہ تھی۔ لیکن اس ڈر نے اسے کمزور کر دیا تھا۔

آج پھولوں پر اُداسی طاری تھی۔ شاید ان کا سیزن ختم ہو رہا تھا۔ کچھ پھول مرجھا کر گر گئے تھے۔ کچھ پژمردہ سے تھے۔ بعض شاخوں پر سر نہوڑائے ہوئے تھے ان کے چہروں سے رنگ اڑ گئے تھے۔ اور ہارسنگھار میں بھی اب اکا دکا پھول لگے تھے۔ ہاں اب سبز رنگ کی ڈوڈیاں ہر شاخ پر بے شمار لگی ہوئی تھیں۔ یہ چوکور ڈبیہ سی تھی اس لیے اسے دُونی کہا جاتا تھا۔ دراصل اس میں بیج تھے۔ انجو نے ایک دونی توڑ لی۔ دیکھنے کے لیے کہ اس کے اندر بیج کتنے ہیں اور کس شکل کے ہیں دونی ابھی سوکھی نہ تھی۔ پھر بھی اس کے پرت الگ کرنے پر اندر سفید سفید کئی بیج برآمد ہوئے۔ سوکھ کر کالے ہو جاتے ہوں گے۔ ایک پھول کے عوض کئی پھول۔ تو اس طرح افزائش ہوتی ہے۔

"یوں حیران نہ ہوں۔ یہ تو قدرت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے"۔ یہ کون بولا تھا۔

اس نے جھٹ بیج گرا دیے۔

"سنیے۔ ہاتھ آئی شے کو گرا دینے میں آپ کو لطف آتا ہے یا عادت بنالی ہے"۔

احتشام شاید پہلے سے وہاں موجود تھا۔ یا بعد میں آیا تھا۔

"یہ لان کئی دن سے سونا سونا تھا۔ آپ نے اتنی دیر کیوں کی آنے میں؟"

عجیب سوال تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اور جانے کے لیے مڑی تو احتشام نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"پھول نہیں لیں گی؟ یہ آخری زمانے کے تھوڑے سے پھول۔ آئیے میں دیتا ہوں۔ اب یہ اگلے سال"۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" یہ خوفناک دھاڑ سے مشابہ آواز۔ ممانی کی تھی۔ احتشام کی آپا جان۔

رات ان کے پیٹ میں گرانی سی تھی۔ رات کو اٹھ اٹھ کر ٹہلتی رہی تھیں۔ صبح سوچا کہ گھاس پر ٹہلیں تو شاید آرام آئے۔ گیلری کا دروازہ کھلا پایا۔ دھک سے رہ گئیں۔ اگر چور آیا تھا۔ تو جو لے جانا تھا۔ لے جا چکا ہو گا۔ پھر بھی انہوں نے باہر جھانک کر دیکھ لیا۔ شاید قدرت انہیں وہ ڈراما دکھانا چاہتی تھی

یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ ماذا، ندا کے حق پر ڈاکا ڈال رہی ہے یہاں تو معاملہ ہی دیگر نکلا۔

انہوں نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا روتی ہوئی انجو اور صفائیاں پیش کرتا احتشام انہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ انہیں صرف اپنا نقصان نظر آ رہا تھا (ابھی کل ہی تو انہوں نے اپنی بھولی بسری چچی کو خط لکھا تھا جس میں اپنی بیٹی کو احتشام سے منسوب کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ حق جتانے والے انداز میں۔ ہائے۔ ابھی خط بھیجا بھی نہیں۔ اور یہاں یہ گل کھل گئے) دن تو ماذا کے ساتھ کھیل کود تفریح میں گزرتا ہے اور صبح۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہاں سب سو رہے ہوں گے۔ خوب وقت چنا ہے گلچھرے اڑانے کے لیے۔

انہوں نے دونوں کو ایسی بے بھاؤ کی سنائیں کہ کوئی کسر نہ رہ جائے۔ احسان جتانے کے ساتھ الزامات۔ تہمت۔ کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے دیا۔ احتشام کو کھلانے پلانے۔ پیار محبت دینے کے ساتھ

مشہور و معروف افسانہ و ناول نگار
رفعت سراج
کے افسانوں کا مجموعہ
کستوری
کا دوسرا ایڈیشن
شائع ہو گیا ہے
قیمت /75 روپے
سول ایجنٹ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی

رکھنے۔

اور انجو پر تو بس نہ چلتا تھا کہ کیا کچھ سنائیں۔ گاؤں کی گنواری۔ کہاں نصیب میں تھیں اسے یہ نعمتیں جو یہاں ملیں۔ کبھی خواب میں بھی اس نے یہ عیش نہ دیکھا ہوگا۔ روٹیاں لگ گئیں۔ ماموں کی عزت کا جنازہ نکال دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

نانی جو شور سے جاگی تھیں۔ روتی بلکتی نواسی کو اپنے کپڑے اس پرانے سوٹ کیس میں تہہ در تہہ رکھتے دیکھ کر اور بہو کو چیختے چلاتے سن کر حواس باختہ ہو رہی تھیں۔ کبھی دوپٹا گھسوٹتیں۔ کبھی عینک لگاتیں۔ بالوں کا بار بار جوڑا بناتیں جو بن نہ پاتا۔ اور انجو کے ہاتھ سے کپڑے چھوٹے جاتے۔ وہ اندھوں کی طرح سے سوٹ کیس کو ٹٹول رہی تھی۔ اس نے اپنی صفائی میں ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ آنسوؤں کی چادر میں دل سے اٹھتا ہوا دھواں بھی کچھ بولنے نہ دیتا۔ اور وہ کہتی بھی کیا۔

ایک نانی تھیں جو ان کی بے گناہی پر یقین رکھتی تھیں۔ انہوں نے احتشام سے کہہ بھی دیا۔

"بھیا! مجھے تو شبانہ کی کسی بات کا یقین نہیں۔ ارے۔ گھر کے اندر کوتے کھدروں کی کمی ہے جو دن دہاڑے لان پر جا کر۔"

احتشام بہت سنجیدہ تھا۔ بلکہ اب وہ بھی بالکل چپ کھڑا تھا۔ جب انجو نے کسی طرح کانپتی انگلیوں سے سوٹ کیس بند کر دیا تو اس نے دروازے سے ہی کہا۔

"آیئے چلیں۔" انجو نے سوٹ کیس اٹھایا پھر گرایا۔ اور دوڑ کر نانی کے گلے سے چمٹ گئی۔ اور پھوں پھوں روتی ہوئی کسی ننھی بچی کی طرح سوٹ کیس اٹھا کر گیلری میں آ گئی۔ اور احتشام کے ساتھ نکل گئی۔ کمرے کی کھڑکی سے دونوں بہنوں نے انہیں پورچ سے ڈرائیو وے پر جاتے دیکھا۔ وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دونوں کے سر اٹھے ہوئے تھے۔ مجرموں کی طرح جھکے ہوئے نہیں تھے۔

احتشام نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لینا چاہا جو اس نے نہیں دیا۔ پھر وہ گیٹ پر کھڑے ہو گئے۔ جو بند تھا۔ ابھی اس گھر میں صبح کہاں ہوئی تھی۔ گیٹ مقفل تھا۔ صبا ہی کمرے سے دوڑتی ہوئی آئی گیلری کی دیوار سے چابی اتار کر باہر نکلی۔ تب تک دونوں اسی طرح کھڑے تھے۔ جب صبا نے گیٹ کھولا۔ احتشام نے نرمی سے کہا۔

"تھینک یو صبا!" اور صبا کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "امی بہت جذباتی ہو جاتی ہیں۔"

پھر اس نے انجو کو چور نظروں سے دیکھا۔ اب وہاں آنسو نہیں تھے۔ اس کے ہونٹوں پر تھرتھراہٹ البتہ تھی۔ صبا کو وہ ویسی ہی سادہ اور عام فہم نظر آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر انجو کے رخسار چومے۔

"سوری انجو! تم کوئی ملال لے کر نہ جانا۔ ہم لوگوں کی طرف سے۔ بس امی۔"

انجو نے بھی اسے گلے لگا لیا۔ اور سر ہلاتی خدا حافظ کہہ کر گیٹ کے باہر چلی گئی۔ گزرتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر احتشام نے پچھلا دروازہ کھولا اور دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

ٹیکسی چلی گئی تو صبا واپس آئی۔ کمرے میں ندا پلنگ پر بیٹھی تھی اور بلک بلک کر رو رہی تھی۔

نوید کسی میچ کے سلسلے میں پشاور گیا ہوا تھا۔ درید معید وغیرہ نے اگر شور سنا بھی ہوگا تو وہ اوپر سے نیچے نہیں آئے۔ یہ ان کی گہری نیند کا وقت تھا۔

ابا جان البتہ جاگ جانے کے بعد جو سب کچھ سن کر بالکل خاموش رہے۔ انہوں نے کوئی رائے زنی بھی نہیں کی۔ وہ دن سب کے لیے بڑا بوجھل اور اداس تھا۔

رات کو نوید آ گیا۔ اس کی ٹیم ہار گئی تھی۔ اس لیے وہ بہت جھلایا ہوا تھا۔ رات دیر تک وہ معید، درید اور (اس کی آمد کی خبر سنتے ہی دوستوں کی یلغار) دوستوں کو ٹورنامنٹ کی داستان غم سناتا رہا۔ کس طرح آفت گزری۔ کیسے ٹیم کے بیشتر ارکان بیمار ہوئے۔ چلی کباب کھا کھا کر ان سب کے معدے چوپٹ ہو گئے اور وہ ان فٹ ہو گئے۔ ناچار وہیں کسی کلب سے مقامی کھلاڑی مستعار لیے گئے۔ جنہوں نے ہرانے میں کردار ادا کیا۔ دراصل یہ سب چالاکیاں مقامی انتظامیہ کی تھیں۔ جو ہم نازک مزاجوں کو ان فٹ کرنا چاہ رہے تھے۔ چلی کباب میں مرچیں۔ اوہ میرے خدا۔

"یار اس میں ضرور کوئی راز ہے۔" آزر نے جو جاسوسی مزاج رکھتا تھا۔ اور تہہ تک پہنچنے [illegible] شائق نہ تھا۔ غور کرتے ہوئے کہا۔

"اور یاد رکھو [illegible] معاملوں میں راز ضرور ہوتا ہے۔ ورنہ لاہوریے اتنے بھی نازک مزاج اور پیٹ کے ہلکے نہیں ہوتے۔ یعنی معدے کا جہاں تک تعلق ہے۔"

"بالکل۔ بالکل۔ دن بھر کچی مولیاں۔ کھیرے بھٹے کھانے والے۔ بھاٹی کے مرغ چھولے۔ قتلمے ٹھونسنے والے۔ قصور کا فالودہ قلفہ شرط لگا کر ہضم کر جانے والے۔ اتنے نازک مزاج۔"

"پیڑے کی لسی پی کر ڈکار تک نہ لینے والے۔ لوہاری گیٹ کی نہاری کا ناشتا کرنے والے۔ اور یاد ہے آسٹریلیا کی ٹیم آئی تھی۔ تو للی کو پیڑے کی لسی پلائی تو اس نے کہا تھا۔ اس نے میرے معدے کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔"

"یار۔ تو بھولا ہے۔ بھلا لاہوریے چلی کباب کھا کر بیمار ہو جائیں۔" افتخار دور کی کوڑی لانے میں استاد تھا۔

"یہ ضرور کسی شرط کے چکر میں آ گئے ہوں گے۔ جیب گرم کرنے کے لیے۔ ہار گئے۔"

"حیات آباد سے شاپنگ تو سب نے کی ہوگی۔ اور تم آ گئے بیگ جھلاتے ہوئے۔ وہی جو لے گئے تھے۔"

"پتا نہیں۔ میں تو بھاگنے کے چکر میں۔ یار ایسا نہیں ہوتا۔ گیم گیم ہوتا ہے۔ شرط نہیں۔ آئی ایم [illegible] ہیں یار۔" اس نے سینہ پھلا کر کہا۔

"بات تو یار ٹھیک ہے۔ مگر اب گیم صرف گیم [illegible] ہے۔ اسپورٹ نہیں رہا۔ اور اسپورٹس [illegible] کو سب گھول کر شربت کی طرح پی گئے ہیں!"

[illegible] رنجیدہ تھا۔ اسے اپنی ٹیم کے ارکان [illegible] کی امید نہ تھی۔ دوسرا دن اس نے [illegible] گزار [illegible] کرتے۔ شام کو آیا تو امی نے اسے وہ نئی خبر یوں سنائی جیسے کوئی دھماکا کرنے والی ہوں۔ مگر نوید لاپروائی سے بیگ سے کپڑے نکال کر فرش پر ڈالتا رہا۔

"سن لیا ہے میں نے۔" آخر اس نے کچھ بگڑ کر کہا۔ "میں نے ماموں کو آفس فون کیا تھا۔"

"اس نے تو خود کو معصوم ظاہر کیا ہوگا۔ صفائیاں دی ہوں گی۔"

"صفائیاں کیسی؟ انہوں نے تو اپنے جرم کا اقرار کیا۔ کہ ان کی وجہ سے وہ بے چاری۔"

"کیا۔ بے چاری۔ چالاک عیار چھوکری۔"

"امی پلیز۔ اپنی زبان خراب نہ کریں۔ ویسے بھی وہ بے قصور ہے۔"

"کیا بے قصور؟ بڑی پہنچی ہوئی ہے۔ یہ گاؤں والیاں شہر آ کر لڑکوں کو پھانسنے کا کام کرتی ہیں۔ بڑے گر آتے ہیں انہیں۔"

"امی! جس بات کا آپ کو علم نہ ہو۔ اس کو اتنے یقین سے نہ کہا کریں۔"

"کیا۔ ارے میں نے اپنی آنکھوں سے۔" وہ دھم سے پلنگ پر بیٹھیں۔

"بعض اوقات امی۔ آنکھیں جو دکھاتی ہیں۔ وہ دھوکا نظر کا ہوتا ہے۔ اور کان جو سنتے ہیں وہ محض آواز کے سالنے ہوتے ہیں۔ سچ نہیں۔"

وہ آنکھیں پھاڑ کر رہ گئیں۔ "اس لڑکے کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ غضب خدا کا۔ اس لڑکی کو میں نے ان کھلی آنکھوں سے وہاں پیڑ کے پیچھے دیکھا۔ اس کا ہاتھ اس بدبخت کے ہاتھ میں تھا۔ اور یہ کہتا ہے دھوکا ہے نظر کا۔" وہ بیزار ہو کر اس کے پاس سے آ گئیں۔

ایک اور دھکا۔ کسی نے خبر دی کہ سجاد امریکہ سے اسی وقت آئے گا۔ جب اسے یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے ابا کی نامزد کردہ لڑکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر رائے دے۔

سجاد نے واپسی کا پروگرام آگے بڑھا دیا۔ اپنے باپ کے جواب کے انتظار میں۔ اور انہوں نے اخلاق صاحب سے رائے لی۔ سجاد کی اس بات پر گھر بھر

میں اُداسی دوڑ گئی۔

دن زناٹے سے گزرتے لگے۔ موسم بدلا، خزاں چھا گئی۔ نوید ایم بی اے سے فارغ ہوا۔ معید نے امریکا جانے کی رٹ لگا لی۔ نوید کے کئی دوست جُدا ہو گئے کسی کی شادی کسی کی سروس۔ امی سر پیٹ کر رہ گئیں کہ نوید ہی کسی قابل ہوتا تو اس کی بھی شادی کی جاتی۔

چچا ابا کا خط آ ہی گیا مگر اخلاق صاحب نے کہا کہ سجاد کو آنے دیں۔ اسے اپنی شریکِ حیات منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔ انہیں جتنا صبا کا خیال ہے وہ سجاد کی بہو کے بھی اسی قدر خواہاں ہیں۔ زبردستی کی ضرورت نہیں۔

اس دن معید نے آ کر خبر دی۔ کہ احتشام اسے لبرٹی میں ملا تھا۔ اور یہ کہ ان کے ساتھ ایک برقعہ پوش خاتون تھی۔ جس نے چہرے پر دُہری نقاب ڈالی ہوئی تھی۔ برقعہ پوری آستین کا تھا پھر بھی ماموں مڑ مڑ کر ان خاتون کو چیک کر رہے تھے کہ وہ نقاب ہٹا کر جھانک تو نہیں رہیں۔

"اے ہے۔ کون تھی نگوڑ ماری۔" دادی کو بڑی فکر ہو گئی۔

"اور کون ہو گی۔ وہی آپ کی پینڈو نواسی۔ وہی تو بے حیائی کے ریکارڈ توڑتی ہوئی اس کے ساتھ گھر سے نکلی تھی۔" امی کے لہجے میں قلق، ملال اور غصہ تھا۔

"امی!" نوید نے فوراً ٹوکا۔ "جس بات سے آپ کو پوری آگہی نہ ہو اس کو اتنے وثوق سے نہ بیان کیا کریں۔"

"میرے سامنے۔ اے سب کے سامنے نکل کر گئی تھی۔ وہ اس خبیث کے ساتھ۔ وہ تھی ہی ایسی۔ اسی لیے پردہ کروا رہا ہو گا کہ وہ کسی اور سے آنکھ مٹکا نہ کرے۔"

"امی! بس آپ چپ ہو جائیں۔ جس بات سے آپ کا تعلق نہیں۔ اس پر فضول رائے زنی۔"

نہ جانے نوید کو کیا ہو گیا تھا۔ اس پینڈو کا ذکر آتے ہی آگ بگولہ ہو جاتا۔

صبا کے پوچھنے پر اس نے اقرار کیا۔ "ہاں بھئی ماموں نے شادی کر لی ہے۔ مجھے اتنے پیار سے بلایا جانا پڑا۔ اب ہم پرانے رشتوں کو بھول تو نہیں سکتے۔"

"شادی۔ کس سے ہوئی ہے؟" ندا نے تقریباً بسور کر پوچھا۔

"ہائیں۔ ماذا سے۔ اور کس سے ہوتی۔"

"ماذا۔ ماذا۔ ماذا۔" گھر میں اس کا نام گونجنے لگا۔

"بھئی ماموں نے سوچا۔ جس کو وہ چاہتے ہیں۔ وہاں تو نو لفٹ کا بورڈ لگا ہے۔ تو جو اُن کو چاہتا ہے اسی کے ہو جائیں۔ یہ نظریہ بھی خاصا دلفریب ہے۔" نوید نے دانت چمکائے۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ اب تک پیٹ کے حوض میں غرق کیے رکھی یہ خبر۔" امی خفا تھیں۔

"آپ نے کہا تھا اب اس گھر میں احتشام کا نام نہ لیا جائے۔ نام لیے بغیر خبر کیسے سناتا۔"

"مگر ماذا تو بہت ایڈوانس ہے۔ وہ پردہ نشین کیسے ہو گئی۔"

"ماموں نے شرط ہی یہ رکھی تھی۔ وہ مان گئی۔"

امی برابر غور کیے جا رہی تھیں کہ یہ کیسے ممکن ہے انہوں نے اس کے ہاتھ میں انجو کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور ماذا کے ماں باپ نے آخر احتشام میں کیا دیکھا کہ اپنی حور، پری چہرا بیٹی اس نقٹے کے حوالے کر دی۔ داماد تو انہیں اپنے برابر کا بلکہ بہتر بھی مل ہی جاتا۔ ایک ہی تو داماد آنا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کیا انہوں نے جو دیکھا، وہ فریبِ نظر تھا۔ اس جاہل لڑکی کو ایسا رشتہ بھلا کہاں مل سکتا تھا۔ آخر اس نے انکار ہی کیا ہو گا۔ مگر کیوں۔ ماذا کو جہیز بھی خوب ملا ہو گا۔ بہت دولت مند باپ ہے اس کا۔ مجھے خبر ہوتی تو میں ہی رشتہ ڈال دیتی۔ وہ نوید میں بھی دلچسپی لیتی تھی۔ احتشام تو بعد میں آیا تھا۔ اور چچی کو دیکھو۔ میرے خط کا جواب تو گول کیا ہی تھا۔ بیٹے کی شادی پر کارڈ تک نہ بھیجا۔ کبھی ملیں تو ضرور پوچھوں گی۔

گاؤں سے انجو کا خط آیا تھا۔ اس کے والد فوت ہو گئے تھے۔ ماں کی بیماری اور صدمے کا ذکر بھی تھا۔ خط دادی کے نام تھا۔ وہ خاصی افسردہ ہو گئیں۔ برسوں پہلے انجو کی ماں سے اخلاق کی شادی کی بات چلی تھی

اخلاق بھی جانتے تھے۔ مگر صبورہ، انجو کی ماں کی قسمت میں اس گھر کا عیش آرام نہ تھا۔ اس کے والد کو ایک زمیندار پسند آ گیا۔ اس کی شان و شوکت سے مرعوب ہو کر بیٹی بیاہ دی۔ اس کی زندگی تباہ کر دی۔ کیا حسن تھا۔ اور کیا جمال تھا۔ اس کے وجود سے روشنی سی پھوٹتی تھی۔ مگر چند سالوں میں بجھ کر رہ گئی۔ کئی بیٹے ہوئے۔ بچے ہی نہیں۔ دادی صبا اور نوید کے سامنے قصے سنایا کرتیں۔

پھر کچھ دن اور سرکے۔ معید کو امریکہ کی کسی ریاست کی یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ وہ رخصت ہوا۔ نوید بزنس میں مصروف ہو گیا۔

پھر سجاد امریکہ سے آ گیا۔ چچا ابا نے لکھا تھا۔ وہ بہت جلد سجاد کو لے کر آئیں گے۔ خوشیاں تابڑ توڑ ملیں۔ امی بہت خوش تھیں۔

صبا اور ندا شاپنگ سینٹر میں سینڈل پسند کر رہی تھیں۔ اپنے پیچھے ایک مانوس سی آواز پر ندا نے سر گھما کر دیکھا۔ اور اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔ معید نے جھوٹ کیوں بولا۔ اس کی پشت والی سیٹ پر ماذا بیٹھی تھی۔ بالکل آزاد۔ دوپٹے کے بغیر۔ جدید فیشن کے لباس میں۔ اس نے بھی سامنے کے آئینے میں ندا کو دیکھ لیا۔ اور سب کچھ چھوڑ کر جوتے اور ڈبے پھلانگتی ہوئی آئی۔ دونوں بہنیں ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔ ان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"بھئی۔ کیا میرے سر پر سینگ اگ آئے ہیں جو تم دونوں اس قدر سراسیمہ ہو رہی ہو۔"

"آہم۔" آخر صبا نے گلا صاف کر کے کہا۔ "دراصل ہم نے سنا تھا کہ تم پردہ وغیرہ کرنے لگی ہو۔"

"ہاں بھئی، ڈیڑھ سال کی قید بامشقت تھی۔ اب رہائی ملی ہے۔ ہائے میں تو تم سے ملنے کو بے قرار تھی۔"

"تو ہمارے گھر آ جاتیں۔"

"لو۔ کیسے آ جاتی۔ وہاں تو سب میرے سر پر جوتے ہی مارتے۔ اچھا اب اٹھو۔ میرے ساتھ چلو۔"

صبا نے جلدی جلدی سینڈل پیک کروائے۔ ماذا کی گاڑی کھڑی تھی۔ انہیں احتشام سے ملنے کا اشتیاق بھی تھا۔ ڈیڑھ سال برقعہ اوڑھا کر اس قدر آزادی دے دی کہ محترمہ دوپٹے اور آستینوں سے بے نیاز ہو گئیں

مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب ماذا نے گاڑی اپنے باپ کی کوٹھی کے اندر جا کر روکی۔ وہ انہیں اپنے کمرے میں لے آئی۔

"تمہاری آنکھوں سے ٹپکتے سوال کا جواب یہ ہے کہ۔ اب یہی میرا گھر ہے۔"

"اور۔ ماموں۔ کا گھر؟"

"ان کو بھی چھوڑا۔ ان کے گھر کو بھی۔"

پھر اس نے بڑی عجیب کہانی سنائی۔ یہ کہانی اس کی محبت کی۔ ضد کی۔ اور اس شخص کے خودداری کے بت کو توڑنے کی خواہش کی تھی۔ مقصد زندگی من پسند ہستی کا حصول تھا۔ اور اس نے جو شرائط پیش کیں اس کو کسی لیت و لعل کے بغیر قبول کر لیا۔ صرف اس توقع میں کہ شرائط کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاتی۔ ایک بار حاصل کر لیا تو پھر۔ ہر محاذ پر کامیابی کا امکان ہے۔

"ڈیڑھ سال سخت پردے میں گزرے۔ ہر کام کیا۔ کھانا پکایا۔ گھر صاف کیا۔ چھوٹے سے چھوٹا۔ بڑے سے بڑا۔ پھر بھی مزاج خراب ہی رہتے۔ اور تمہارے ماموں نے مجھ پر باہر کی دنیا کا ہر منظر حرام کر دیا۔ گھر کے اندر رہتے رہتے مجھ پر پھپھوندی سی لگنے لگی۔ فرش صاف کرتے کرتے ہتھیلیاں گھس گئیں۔ میک اپ پر پابندی۔ فیشن کے لباس کی ممانعت۔ ہنسنے پر اعتراض۔ ایک امید پر سب کچھ جھیلا کہ کبھی تو اس سنگدل کا رویہ بدلے گا۔ کبھی تو وہ پسیجے گا۔ مگر اس کی آنکھوں میں کسی اور کا عکس تھا۔ اس کے دل پر کسی اور کی حکومت تھی۔ وہ مجھ سے اپنی ناکام محبت کا انتقام لیتا رہا۔ اور مجھے دھتکارتا رہا۔"

"پھر؟" ماذا ذرا کی ذرا رکی تو ندا نے سوال کیا۔

"میں سوچتی رہی کہ میں نے جو ماں باپ کی نافرمانی کی ہے، یہ اس کی سزا ہے۔ مگر۔ وہ تو پتھر کا مجسمہ تھا۔"

"وہ کس سے محبت کرتے تھے؟"

"تمہاری اس دیہاتی کزن سے۔ مگر جس نے کسی وجہ سے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو تسخیر کر چکے تھے۔"

اس کے بعد کی کہانی کچھ یوں تھی کہ ماذا مایوس ہو گئی۔ یا شاید تھک گئی۔ تو اس نے علیحدگی اختیار کر لی۔

اس کے بعد باقاعدہ عدالت سے خلع لی۔ اس نے تب بھی پروا نہ کی۔ اور ماں کے ساتھ عمرے کے لیے چلا گیا۔ میرے لیے تو اس کے پاس نوکر رکھنے کی استطاعت نہیں کا بہانا تھا۔ مگر عمرے کے لیے جانے کہاں سے رقم آ گئی۔

"جب۔ تم برداشت کر ہی رہی تھیں تو۔ کچھ دن اور صبر کر لیتیں۔" صبا نے آہستگی سے کہا۔

"دراصل۔ مجھ میں۔ قوتِ برداشت نہ رہی۔ وہ آخری حکم۔ اس کی تعمیل میں نہ کر سکی۔ تو اس نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا۔"

"آخری حکم؟"

"ہاں۔ کہ میں روز اس کی ماں کے پیر دباؤں۔ سر پر تیل لگاؤں۔ دوا پلانے کی ذمے داری لوں۔"

ماذا کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اب پچھتا رہی تھی۔

"میں اس کے سارے احکام پورے کر رہی تھی۔ وہ میری ایک بات نہ مانتا۔ رات دس گیارہ بجے تک میں ہر کام سے فارغ ہوتی تھی۔ اس کے بعد اماں کے کمرے میں بھی وقت ضائع کروں۔ کیوں۔ بیوی تھی میں۔ جس کی خاطر یہ سارے عذاب مول لیے تھے۔ اس کے ساتھ رات کے چند گھنٹے ہی تو مجھے ملتے تھے بھیک کی طرح۔ اماں کی وجہ سے میں اس سے بھی محروم ہو جاتی۔ اور میں نے کبھی اپنی ماں کے پیر نہیں دبائے۔ تیل نہیں لگایا۔ تو ساس کے کیوں؟"

"تم نے اور بھی بہت سے کام اپنے ماں باپ کے گھر میں نہیں کیے تھے۔ مگر وہاں کرنے پڑے۔"

"ہاں، یہ تو اب خیال آتا ہے اس وقت تو بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ امی بھی کہتی ہیں۔ میں نے غلطی کی۔ خدمت کر لیتی تو شاید۔ دل اس کا موم ہو جاتا۔ اب سوچتی ہوں۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ برداشت ہی نہ رہی۔"

"کیا پچھتا رہی ہو؟" صبا نے سوال کیا ماذا کا سر جھک گیا۔ ناخن دانتوں سے کترنے لگی۔ ندا سر پکڑ کر رونے بیٹھ گئی۔

"دراصل ضد سوار تھی۔ تو امی کی نصیحت بھی بری لگی۔ شادی کے لیے بھی اتنی بے قرار تھی۔ کہ ابا جی کی خواہش کی پروا نہ کی۔ ورنہ آج عیش کر رہی ہوتی۔

اب تو داغ لگ گیا۔ اور تیر کمان سے نکل گیا۔ اس کے علاوہ۔ میرا وہ کزن۔ جس نے مجھے اس زندگی سے نفرت دلائی تھی۔ واپس امریکہ چلا گیا۔ حالانکہ اس نے خود کہا تھا کہ۔ وہ میرا ہاتھ تھام لے گا۔ بس۔ امریکہ کا نام۔ میری بربادی بن گیا۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ پھر ماذا کی سسکیوں نے اس مصنوعی سناٹے کا حصار توڑ دیا۔

اور اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ خلع کے سلسلے میں عدالت کے چکر لگوا کر ماذا نے احتشام کے دل سے رہی سہی قدر بھی کھو دی۔

"کیا انہوں نے انجو آپا کا نام لیا تھا؟"

"نہیں مگر میرا اندازہ ہے۔ بلکہ یقین ہے۔ بس اتنا کہا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو تسخیر کر چکے تھے لیکن۔ اس کی کوئی مصلحت تھی اس لیے ادھر سے انکار ہو گیا۔"

"پھر وہ انجو نہیں تھی۔" صبا مطمئن تھی۔ "انجو کو احتشام سے انکار کی ہمت نہیں ہو سکتی۔ نہ ان کی کوئی مصلحت ہی تھی۔"

وہ دونوں بڑی افسردہ سی گھر آئیں۔

"میں ماموں سے ملوں گی۔"

"نہیں آپا۔ امی پسند نہیں کریں گی۔"

"انہیں بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔"

اس نے احتشام کے آفس کا نمبر لے کر فون کیا۔ اور امی کی غیر موجودگی میں سعید کو لے کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آ گئی۔ اس نے ماذا کی طرف سے بھی کامیاب جنگ لڑی تھی۔ اور انہیں شرمندہ کرنے کی کسر نہ چھوڑی۔ اور مردوں کو ناقابلِ اعتبار ثابت کر کے آ گئی۔

"اس سے کیا فائدہ آیا۔" ندا مایوس ہو گئی۔

"میں فائدہ اٹھانے نہیں۔ انہیں شرمندہ کرنے گئی تھی۔ اور وہ کر کے آ گئی۔"

اس نے تفصیل تو بتائی نہیں۔ مگر ندا نے محسوس کیا کہ وہ سوچ میں گم ہے۔

اچانک ہی ایک دن انجو آ گئی۔ سب حیران تو بہت تھے۔ مگر چونکہ اس کے والد کی وفات ہوئی

تھی تو ممانی نے اس سے افسوس کا اظہار کیا۔ نانی نے لپٹا کر آنسو بہائے۔ ان کی پیاری بھانجی بیوہ ہوئی تھی۔ نواسی یتیم ہوئی تھی۔ افسوس تو انہیں بہت تھا مگر۔

"سدا کا بیمار تھا۔ تکلیف سے نجات پائی" والا انداز بھی تھا۔ انجو نے شاید پچھلی بار کی ذلت فراموش کر دی تھی۔ یا وہ اسے اہمیت نہیں دینا چاہ رہی تھی اس لیے اس نے یہ بھی جتا دیا کہ وہ ماموں کے بلاوے پر آئی ہے۔ ممانی کو یقین تو نہ آیا۔ مگر جب اس کی ساس نے کہا۔

"ماں کو بھی ساتھ لے آتی۔ اخلاق نے لکھا تو تھا۔" گویا انہیں علم تھا۔ اور ستم دیکھو کہ اخلاق نے بیوی سے ذکر تک نہیں کیا۔

"وہ بھی آئیں گی۔ میں ذرا سیٹل ہو جاؤں۔"

صبا اور ممانی نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔

"وہ۔ دراصل۔ مجھے یہاں سروس مل گئی ہے۔" اس نے رک رک کر بتایا۔

"اچھا، کہاں؟" دادی نے ٹٹول کر عینک آنکھوں پر لگالی۔

"یونیورسٹی میں نانی۔" اس نے رسان سے بتایا۔

"چپراسن کی جگہ ہو گی۔" یہ ممانی کا خیال تھا۔

"تو بیٹا پھر۔ گھر ور کا کیا ہو گا۔"

"ملے گا وہیں۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

صبا اور ندا اس کی سروس کو ڈسکس کرتے لگیں لاؤنج میں بیٹھ کر۔ نوید گنگناتا ہوا باہر سے اندر آیا۔

"وہ آپ لوگوں کی پینڈو کزن ڈاکٹریانی ابھی تک گھر نہیں پہنچی؟" اور دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کیوں؟ سنگ نکل آئے ہیں میرے سر پر؟"

"آپ کو۔ اس کے آنے کی خبر کیسے ہوئی؟"

"پھر کیسے ہوتی۔ بھئی اسٹیشن سے لانے کی ذمے داری تو میری ہی تھی۔ مگر انہیں پھپھو کے گھر جانا تھا پہلے۔ آگئی کیا؟"

"جی۔ بھائی۔ انجو آپا کو یونیورسٹی میں سروس ملی ہے۔"

"اچھا۔ بتا دیا یہ بھی۔ ہاں بھائی۔" وہ لاپروائی سے دھم سے صوفے پر گرا۔ "موصوفہ کا خاصا ٹھکانہ ہے وہاں۔"

"وہ۔ کریں گی کیا وہاں پر۔" ندا نے خاصا ڈر کر سوال کیا تھا۔

"نہایت جاہلانہ سوال ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھانے کی ہی نوکری ملتی ہے۔ ان جیسی محترمہ کو۔ جس نے ٹاپ کیا ہوا ایم اے میں۔"

صبا اور ندا کرسیوں سے یوں اٹھیں جیسے کسی اسپرنگ نے انہیں اچھال دیا ہو۔ امی بھی کمرے سے نکلیں۔

"کیا بکتے ہو نوید۔ ہر وقت کا مسخرا پن۔ بے پڑھے کون پڑھا سکتا ہے؟"

"آپ کو کس نے بتایا کہ وہ جاہل ہے؟"

"اور تم کو کس نے یہ خبر دی ہے کہ وہ یونیورسٹی تک پڑھنے جا چکی ہے؟"

"کیونکہ۔ یہ میں تھا جو اسے اپنی بائیک پر لے جاتا تھا بسا اوقات۔"

کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ نوید کس قسم کے مذاق پر تلا بیٹھا ہے۔

سجاد کو اگلے دن آنا تھا۔ اس لیے سب اس کی تیاری میں لگ گئے۔ گھر جو پہلے ہی کافی صاف ستھرا تھا۔ مزید جھاڑا پونچھا گیا۔ سیٹنگ تبدیل کی گئی بار بار۔ صبا اپنی ککنگ کی مہارت کو کام میں لاتے ہوئے بسکٹ، کیک، نان خطائیاں بنانے لگی۔ سب کا خیال تھا کہ وہ سیدھے انہی کے ہاں آئیں گے۔ اور دو چار دن قیام کریں گے۔ نوید لان کی گھاس برابر کرتے لگا۔ مسلسل مالی کو غائبانہ ڈانٹ پلاتا رہا۔

"بھائی بالکل ابا پر پڑے ہیں۔" ندا میدے میں انڈے مکس کرتے ہوئے بولی۔ "ہر بات اپنی حد تک رکھتے ہیں۔ ابا کی خط و کتابت کا کبھی علم ہی نہیں ہوا۔"

"اور انجو کے یونیورسٹی لانے لے جانے کی بات بھی نوید نے اپنے تک محدود رکھی۔ اگر بتا دیتے تو ہم اتنے حیران نہ ہوتے۔ بلکہ ہم تو خوش ہوتے۔"

"مجھے یقین نہیں۔" امی نے ڈنر سیٹ کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھیں۔ "صورت ہی جاہلوں جیسی ہے انداز بھی وہی۔ چھینٹ کی چادر۔ پرانی چپل۔ حالات تھے بھلا اس کے اس قدر پڑھنے کے؟ کبھی کتاب کھولے نہ دیکھا۔ میرا خیال ہے جھوٹ بول رہی ہے۔"

"امی! آپ نے اس دن بہت زیادتی کی تھی انجو سے۔ اس کا ظرف دیکھیں۔"

"چھوڑو۔ وہ بھول بھی گئی ہو گی۔ جاہلوں کی یادداشت خاصی کمزور ہوتی ہے۔" امی کو ابھی یقین نہ تھا۔

"بھائی بڑے اعتماد سے کہہ رہے تھے۔ پڑھانے کی سروس ملی ہے۔ اور ٹاپ کیا ہے انہوں نے۔ ایم اے میں۔"

ندا جما جما کر کہہ رہی تھی۔ امی نے اونہہ کے انداز میں سر ہلایا۔

"امی۔" صبا نے چیخ ماری۔ اوون بند کیا اور اسٹول پر بیٹھ کر ہلنے لگی۔ صبا غور و فکر کے دوران ہلنا ضروری سمجھتی تھی۔ ندا اور امی سمجھیں۔ کیک جل کر خاک ہو گیا۔

"امی۔" صبا کے ہلتے ڈولتے مجسمے نے آواز نکالی "آپ نے غور نہیں کیا۔ مجھے تو اب خیال آیا۔"

"ہائیں۔ صبا۔ کیا ہوا ہے۔"

"امی! جب ہمارے امتحان ہو رہے ہوتے تھے ہونے والے ہوتے تھے۔ انجو آپا ہمیشہ آتی تھیں۔ ہر سال۔ پھر آخری بار آئی ہیں تو ایم اے فائنل کے پیپر چل رہے تھے۔ اوہ۔ خدایا۔ امتحان کے دنوں میں اپنی پھپھو کے ہاں رہتی تھیں۔ ہمارے ہاں جب آتی تھیں جب پیپرز میں گیپ ہوتا۔ اب سمجھ میں آیا۔ وہ امتحان دینے آتی تھیں۔"

امی تو لاپروائی سے اندر چلی گئیں۔ انہیں کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ دونوں بہنیں اس نئے انکشاف پر سب کچھ بھول کر کھسر پھسر کرنے لگیں۔

مگر امی اندر جا کر اس لاپروائی کے اظہار کو قائم نہ رکھ سکیں۔ انجو کے خلاف ان کے دل میں غبار بھرا ہوا تھا۔ اس کی وجہ تھی۔ اور وہ وجہ اس کی ماں تھی۔

جو اخلاق کی خالہ زاد تھی۔ اور جس سے اخلاق کی تقریباً شادی ہونے ہی والی تھی۔ وہ تو اس کے باپ کو موٹی اسامی نظر آگئی تو بیٹی کو اس دولت پر قربان کر دیا۔ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ اخلاق مجھے کیسے ملتے۔

ایک تو اخلاق میں عجیب عادت تھی۔ بات کو پوشیدہ رکھنے والی۔ پتا نہیں کب سے خط و کتابت تھی انجو سے۔ یا اس کی ماں سے۔ (ساری عمر مجھے شک کی سولی پر لٹکائے رکھا۔) اور اب بھی انجو کو خط لکھ کر بلایا ہے۔ ماں کو بھی بلایا تھا۔ ہونہہ۔ (انہیں تو میری کسی بات کا یقین نہیں) اس دن وہ کس قدر اچھل کر کے انجو کو مجرم ثابت کر رہی تھیں۔ اور اخلاق نے اٹھ کر پوچھا تک نہیں۔ وہ بے حیائی کا مظاہرہ کرتی ہوئی اطمینان سے احتشام کے ساتھ چلی گئی۔ تو روکا بھی نہیں۔ اور شاید انہی کو اس کے پڑھے لکھے یا جاہل ہونے کا پتا ہو تو ہو۔ نوید تو بے وقوف اور سیدھا لڑکا ہے۔

اب سجاد آ رہا ہے۔ پتا نہیں اس کا فیصلہ کیا ہو گا۔ صبا پر تو کوئی اثر ہی نہیں۔ ندا نے کہا آپا بیوٹی پارلر سے وقت لے لو۔ تو بولی۔ میں جیسی ہوں۔ ویسی ہی نظر آنا چاہتی ہوں۔ ندا نے کہا اچھا تو بال ہی سیٹ کرا لیں۔ ندا نے بال سیٹ کرانے کا ٹائم لے لیا مگر وہ۔ بالکل باپ پر گئی ہے۔ اس کے چہرے سے اندر کے جذبات کا اظہار نہیں ہوتا۔ منہ سے بھی کبھی اپنی خواہش کا اظہار نہیں کرتی۔ سنجیدہ نظر آنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ ندا ان سب سے مختلف ہے۔ دکھ میں آنسو بہاتی ہے خوشی میں قہقہے لگاتی ہے۔ میری ہر بات مانتی ہے۔ اب دیکھو۔ سجاد۔ جو آٹھ دس سال یورپ امریکہ رہ کر آیا ہے۔ کیا فیصلہ کرتا ہے۔ لڑکیوں کا بوجھ بھی کس قدر حوصلہ شکن ہوتا ہے۔

صبح انجو یونیورسٹی جانے کے لیے تیار تھی۔ آج اس نے سفید لیلن کی چادر اوڑھی تھی۔ اور اس چھینٹ کے مقابلے میں خاصی معقول نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا نکھار تھا۔ خوشی اور آسودگی۔ یہ تو خاصی خوش شکل ہے۔ ممانی نے اعتراف کیا۔ وہ نانی کے

سامنے جھکی کوئی دعا دم کروا رہی تھی۔ پھر نوید کف کے بٹن بند کرتا ہوا آیا۔ اور سیدھا پورچ میں جاکر اپنی بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔ ندا نے اپنی کھڑکی سے دیکھا۔ وہ باہر نکلی اور چپ چاپ نوید کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اور نوید بغیر کوئی بات کیے زن سے گیٹ سے باہر تھے۔

چچا ابا سہ پہر کو آئے۔ یہ لوگ چچی اماں کے کسی عزیز کے ہاں اترے تھے وہاں سے تیار ہو کر آئے۔ سجاد حالانکہ دس سال باہر رہ کر آیا تھا مگر نوید سے فوراً بے تکلف ہو گیا۔ پھر افتخار آگیا تو نوید، سجاد کو لے کر لان میں آ بیٹھا۔ ڈرائنگ روم میں بزرگ پارٹی محوِ گفتگو تھی۔ دادی بہت خوش تھیں۔ ان کا بڑا بیٹا اور بڑا پوتا آیا تھا۔ پھر سب نے مل کر چائے پی اور چچا ابا کل آنے کا کہہ کر جانے لگے۔ ندا نے کافی حجت کی۔ چچا ابا نے بتایا کہ سجاد کے بے حد عزیز دوست نے ڈنر پر بلایا ہے۔ یہ دوست امریکہ میں سجاد کے ساتھ کئی سال رہا تھا۔ پھر سجاد نے دادی کے آگے جھک کر دعا لی اور سب چلے گئے۔

صبح چچا کا فون آیا۔ سجاد کو ندا پسند آئی تھی۔ سب کے جذبات پر اوس سی گر گئی۔ اخلاق صاحب نے اس کے فیصلے کو سراہا۔ اسے انتخاب کا حق دیا گیا تھا۔ پھر اعتراض کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ ندا بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اسے صبا کا سامنا کرنا مشکل ہو گیا اور جب سامنا ہوا تو وہ رو دی۔ اسے دکھ تو یہ تھا کہ اتنی اچھی آپا کو انہوں نے ریجیکٹ کر دیا تھا۔ مگر صبا نے اسے مبارکباد دی۔ اور خوشی کا اظہار کیا تو وہ سخت پریشان ہو گئی۔

"آپا! آپ کو ریجیکٹ کیے جانے کا دکھ نہیں؟"

"میری بہن کو پسند کیا۔ یہ میرے لیے خوشی کا باعث ہے۔" صبا نے یقین دلایا۔ تو وہ شرما گئی۔

رات کے کھانے پر چچا ابا وغیرہ آ رہے تھے۔ چچا ابا کا رک جانے کا پروگرام تھا۔ جبکہ سجاد، چچی اماں چلے جائیں گے۔ امی کو سجاد پر غصہ تھا۔ جس نے ان کی اتنی پیاری بیٹی کی توہین کی تھی مگر اخلاق صاحب کو کون سمجھائے۔ وہ بخوشی ندا کے لیے راضی ہو گئے۔

شام میں وہ لوگ آ کر بیٹھے ہی تھے کہ احتشام اپنی امی کو لے کر آگیا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ مگر احتشام کی امی نے بڑے اعتماد سے احتشام کے لیے صبا کی خواستگاری کی۔ حیرانی ہی حیرانی تھی۔ امی کو پھر اعتراض ہوا۔ خاصا واویلا مچایا۔ روتی رہیں کمرے میں گھس کر۔ ماں ہو کر ان کا کوئی اختیار یا حق نہ تھا اپنی اولاد پر۔

اخلاق صاحب نے اخلاق برتنے کی حد کر دی۔ ان کے جذبات کا لحاظ نہ کیا۔ ہمیشہ یہی کیا انہوں نے۔ مگر بیٹی تو میری بھی ہے۔ مجھ سے مشورہ کیا؟ آنکھ اٹھا کر ذرا سا عندیہ تک نہ لیا۔ کھٹ سے اقرار کر لیا۔ فوری۔ ارے۔ بیٹی کیا اتنی دوبھر تھی۔ جس کو ذلیل کر کے نکالا۔ اسی کو قبول کر لیا؟

انہوں نے سعید کو بھیج کر اخلاق صاحب کو بیڈروم میں طلب کیا۔ وہ آئے۔ بیوی کی روتی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں کی پروا بھی نہ کی۔ شکوہ لب پر آنے کی دیر تھی کہ بگڑ گئے۔

"آپ کو کیا علم۔ میں نے کیا دیکھا۔ آپ کو بیٹے بیٹی کے مستقبل کی پروا ہے؟ اب تک آپ نے اپنا اختیار ہی استعمال کیا ہے۔ میں نے کبھی دخل دیا۔ صبا بی اے کر کے گھر بیٹھ گئی۔ ندا نے ایف اے تک زحمت کی۔ آپ نے انہیں آگے پڑھنے سے باقاعدہ منع کیا۔ کیوں؟ آپ کو ان کے مستقبل کا خیال ہوتا تو انہیں مجبور کرتیں لڑکیاں تو آج کل لڑکوں سے زیادہ علم حاصل کر رہی ہیں آپ کا بس چلتا تو لڑکوں کو بھی جاہل رکھنے کی تدبیر کر لیتیں۔ آپ سے ذہنی طور پر تو وہ گاؤں میں رہنے والی صبورہ بلند ہے جس نے اپنی بیٹی کو تعلیم حاصل کرنے اور آگے بڑھنے کا شعور دیا۔"

"میں کیا کہہ رہی ہوں۔ آپ۔" وہ زچ ہو گئیں۔ اپنے حق اور اختیار کی بات پس پشت چلی گئی۔

"میں بھی وہی کہہ رہا ہوں۔ جو مجھے کہنا چاہیے۔ اگر آپ کو بہتر فیصلے کا شعور ہوتا تو میں کبھی اختلاف نہ کرتا۔ مجھے اس بچی پر ترس آتا رہا۔ جو تعلیم کے شوق میں ہر سال یہاں آ کر آپ لوگوں کی تحقیر و تذلیل

برداشت کرتی رہی۔ یہاں تک کہ تہمت تک۔ اس کی زندگی کا کوئی مقصد تو ہے۔ آپ کی بیٹیوں کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ افسوس ہوتا ہے مگر میں چپ رہا کہ گھر کے معاملات آپ کے اختیار میں ہیں اور اب۔ جبکہ ان کے بہتر مستقبل کے امکانات روشن ہوئے تو آپ کو یہ بھی گوارا نہیں۔"

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر بیوی کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"اس کے علاوہ آپ کی تسلی کے لیے۔ صبا سے میری بات ہو چکی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں۔ یہ بات کل رات ہوئی۔ جب احتشام کی والدہ جو خیر سے آپ کی چچی بھی ہیں، نے مجھ سے فون پر یہاں آنے کی اجازت طلب کی۔ صبا کے سلسلے میں۔ میں نے اسی وقت صبا کو بلا کر اس کو ان کا ارادہ بتا دیا۔ اس کی مرضی معلوم کرنے کے بعد۔ انہیں فون کر دیا۔ بس۔ یا اور کچھ؟"

حیران و ششدر بیگم کو وہیں چھوڑ کر وہ پھر مہمانوں کے پاس جا بیٹھے۔ جہاں ان کی والدہ احتشام کی امی سے محوِ گفتگو تھیں۔

اتنا کچھ ہو گیا۔ اور انہیں بھنک تک نہ دی۔ صبا۔ مگر وہ اپنی زبان سے کیا کہتی۔ اور اب وہ بھی کیا کر سکتی تھیں۔ منہ ہاتھ دھو کر مصنوعی مسکراہٹ سے چہرا سجا کر مہمانوں کے پاس آگئیں۔ دو سمدھیانے موجود تھے وہاں۔

"لوگو۔ کچھ میرا بھی خیال کرو۔" جیسے ہی ابا جان اپنے کمرے سے سگریٹ لے کر لاؤنج میں آئے۔ نوید نے بہنوں کو مخاطب کر کے فریادی لے میں کہا۔

"حد ہو گئی۔ کسی کو میرا خیال نہیں۔ پہلوٹھی کا ہوں۔ اور پیچھے دھکیلا جا رہا ہوں۔ ہائے۔ میرا مستقبل کیا ہوگا۔ بڑھاپا بڑھا آ رہا ہے۔ اور شادی۔ دور ہوتی جا رہی ہے۔"

ندا نے اشارے سے بتایا کہ ابا جان سن رہے ہیں شرم کرو۔

"تو اور کسے سنا رہا ہوں میں۔ امی کو تو میں دکھائی نہیں دیتا تو میری آواز بھلا کیا سنیں گی۔ کس قدر بات ہوگی جب تینوں بھائی بہن ایک ساتھ نپٹ جائیں گے۔ ندا پلیز۔ امی کو اس سو فیصد بچت اسکیم سے آگاہ کرو۔"

ابا جان مسکراتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے گئے جہاں شادی۔ نکاح میٹنگ اختتامی مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔

"دیکھا۔ دیکھا۔ یہ ہے قدر پہلوٹھی کی اولاد کی۔ کچھ تسلی دیے بغیر چلے گئے۔ میرے معاملے میں ڈنڈی مارنے میں دونوں کا اتفاق قابلِ توجہ ہے۔" وہ کراہتا ہوا صوفے پر ڈھے گیا۔

"ویسے آپا! بھائی کافی بدل گئے ہیں۔" ندا نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "پہلے کی جیسی بے قراری اب نہیں نہ ہی ابا جان سے ڈانٹ سننا بھی کم ہو گیا ہے۔ کیوں بھائی۔ اس تبدیلی کی وجہ؟"

"سارے دوست شادی کر کے۔ سروس کر کے بھاگ گئے۔ اس کے علاوہ مائی سسٹر۔ آئی ایم بزنس مین جس کو غیر سنجیدگی سوٹ نہیں کرتی۔" وہ رعب دار آواز میں بولا۔ تو ندا کو ہنسی آگئی۔

"گویا اب۔ عقل آگئی۔" صبا کی سنجیدگی بھی مستحکم ہو گئی تھی۔ امی کی ناراضگی۔ ناپسندیدگی کو اس جیسی لڑکی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ مگر۔ احتشام کی صفائی۔ یا معذرت امی کی سماعت تک پہنچی ہی نہیں۔ انہیں انجو سے بغض تھا اور موقعہ بھی مل گیا اس کے اظہار کا۔

"ہاں انجو انہیں پسند آئی تھی (وہ ہے ہی اچھی) اس وقت۔ صبح کے ملگجے ماحول میں سبز گھاس کے پرے پھولوں کے پیڑ کے نیچے۔ منہ سر اٹھائے۔ آنکھیں بند کیے پھولوں کی بوچھاڑ میں ہنستی ہوئی کسی حسین پھول کی مانند گی۔ وہ اس فضا کا حصہ بن گئی تھی۔ ادھر سورج کی روشنی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ ادھر اس پر اجالے کا غبار چھا رہا تھا۔ کیا کسی اچھی چیز کو پسند کرنا گناہ ہے۔ پھر ہاتھ پکڑنے کی واردات جو جرم کا ثبوت بن گئی۔ ایسے ہی پسند کے نتیجے میں تھی کہ اس لڑکی کے انداز عام انداز نہ تھے۔ کچھ انوکھے اور سہانے۔ شاید خود کو چھپائے رکھنے۔ ظاہر نہ کرنے کا ردِعمل۔ جو اس حسین فضا۔ طلوعِ آفتاب کے دلکش منظر میں لان کی سرسبز گھاس اور موسم کی

تبدیلی کے نتیجے میں ہلکی سی خنکی سے طبیعت میں جوش اور مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

"اور اگر۔ صباتم ہوتیں۔ تو میں۔ یعنی مجھ جیسا جوشیلا۔ قدرتی مناظر کا دلدادہ صرف ہاتھ پکڑنے پر اکتفا نہ کرتا۔ یقین کرو۔ اسی وقت آپا جان سے تم کو مانگ لیتا اسی وقت۔"

صبا نے تو اس دن ماذا کے سلسلے میں بھی خاصی جھاڑ پلادی۔ جسے سن کر وہ مسکرایا تک نہیں۔ بس زور سے ہنس دیا۔ چوری اور سینہ زوری۔

"ماذا نے وہی کیا، جو اس کی جیسی متلوّن مزاج اعلا سوسائٹی کی پروردہ لڑکی کرتی۔ کام کی اسے عادت نہ تھی۔ اور زیادہ عرصہ وہ اسے نبھا نہ سکتی تھی۔ تو ایک معمولی وجہ کو بہانا بنا کر۔ رشتے کی ڈوری توڑ ڈالی۔"

"مجھے اس سے محبت نہ تھی۔ اس کی کوئی ادا پسند نہ تھی تو میں اس پر نثار بھی کیوں ہوتا۔ شادی اس جرم کی سزا تھی۔ جو۔ اس صبح میرے سر تھوپا گیا۔ ضد مجھے بھی انتہا تک پہنچا سکتی ہے۔ یہ مجھے اس دن علم ہوا جب میں اسے بیاہ کرلے آیا۔ حالانکہ امی کو میں نے تمہارے سلسلے میں آپا جان سے بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔ جو آگلے دن۔ یعنی جس دن تمہارے گھر سے مجھے نکالا گیا۔ آگئی تھیں۔ ان سے پھر بھی میں نے تمہارے لیے سلسلہ چلانے کی بات کی مگر ساری بات سن کر امی نے کہا۔

"میں شبانہ کو جانتی ہوں۔ وہ احساس برتری سے چور اپنی مرضی کی مالک ہے۔ اور اس قصے کے بعد تو وہ مجھے بھی گھر سے نکالنے میں ذرا مروت نہیں کرے گی۔ کجا کہ بیٹی کا رشتہ۔ اب اسے بھول جاؤ۔ ہاں اس لڑکی سے کرنا چاہو۔ تو میں گاؤں جانے کے لیے تیار ہوں۔" مگر میں اس کے لیے تیار نہ تھا، کیونکہ وہ ایک اجنبی ہی تو تھی۔ کوئی چیز اچھی لگنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ۔ اسے سر پر سوار کرلو۔ بعد میں پچھتاؤ۔ جیسا کہ ماذا کے سلسلے میں ہوا۔ اور اب دونوں ہی پچھتائے۔ شاید اگر میں عقل کام میں لاتا اور انجو سے شادی کر لیتا تو۔ نتیجہ یہ نہ ہوتا۔ جو ہوا مگر میں۔ تمہیں کھو دینے کے احساس میں مبتلا رہتا۔ اور انجو بھی اس رسوائی پر مہر تصدیق ثبت کرتے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ ٹیکسی میں میری جذباتی پیشکش پر اس کا یہی جواب تھا۔ بھرپور غصے اور ضد۔ اور انجو کو احساس ندامت سے نکالنے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ ماذا۔ جو میری پیشکش پر خوشی سے ناچ اٹھی۔ اسے اپنی فتح کا اتنا یقین تھا کہ اس نے باپ کی ایک نہ سنی۔ میری ہر شرط اسے منظور تھی۔ جہیز اور سلامی لینے سے میرا انکار۔ کوئی نوکر نہ رکھنے۔ اپنی مالی حالت کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد۔ اس وقت اس کے سامنے من پسند ہستی کا حصول۔ صرف اپنی فتح۔"

"آپا۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ماموں نے آپ سے۔ رشتہ جوڑنے کا خیال پہلے ظاہر کیا ہوتا تو۔ شاید انجو آپا پر۔ وہ الزام امی نہ لگاتیں۔"

ندا بہت ناسمجھ تھی۔ لیکن اب وہ کسی نتیجے کے ردعمل میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

"تم سے کس نے کہا۔ کہ وہ پہلے۔ وہ پہلے بھی کوشش کر چکے تھے۔ میں نے انکار کردیا۔"

"کیوں۔ کیوں آپا؟" ندا تو چلا اٹھی۔ صبا مسکرانے لگی۔ ندا کے چہرے کو ہاتھ لگا کر اس نے نرمی سے کہا۔

"کیوں اس وقت میری پیاری بہن ان سے امیدیں وابستہ کر چکی تھی۔ اور آنسو بہاتی تھی۔ یہ میں یہ گوارا کرلیتی؟"

ندا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آپا کتنی عظیم ہیں۔ سجاد نے انہیں ریجیکٹ کیا۔ احتشام کو انہوں نے میری وجہ سے انکار کیا۔

"آپا!" وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ "اس کا مطلب ہے ماموں نے ماذا سے جس ناکام محبت کا ذکر کیا تھا وہ۔ آپ تھیں۔"

صبا صرف مسکرائی۔

"بے چاری انجو آپا۔" ندا تاسف سے بولی۔

انجو آئی تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ بہت خوش تھی۔ پہلی بار اسے مسکراتے دیکھا۔ نانی کو مٹھائی کھلا کر وہ ممانی کی طرف آئی۔ انہوں نے بڑے تکلف سے ایک گلاب جامن اٹھائی۔ پیچھے سے بے خبری میں نوید نے برفی اٹھاتے ہوئے باقاعدہ

انجو کے کندھے پر ہاتھ ٹکا دیا اور منہ میں لے جاتے سے پہلے امی کی مشتعل نظروں کی پروا کیے بغیر بولا۔

"یہ کس کی منگنی کی مٹھائی ہے بھئی۔ کیا میری منگنی پر تم مٹھائی بھی بانٹو گی؟"

انجو کا چہرہ فق ہوگیا۔ نوید عین اس کی پیٹھ سے لگا کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ اپنی امی کی کرسی کے ہتھے کو تھامے ہوئے۔ دوسرا ہاتھ انجو کے کندھے پر۔ انجو اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ البتہ ممانی نے گلاب جامن زور سے ڈبے میں پٹخ دیا۔ اور اٹھ کر چلی گئیں۔ جاتے جاتے نوید کا ہاتھ اس کے کندھے سے ہٹا کر زور سے ایک جھٹکا سا دے کر پہلو میں پٹخ دیا۔ نوید "اوہو" کہہ کر اپنی بے خبری پر ہنستا ہوا چلا گیا۔ انجو تاسف سے ماں بیٹے کو جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اب وہ کیا کرے۔ لاؤنج میں وہ اکیلی کھڑی تھی۔ ہاتھ میں مٹھائی سے بھرا ڈبہ۔ اور ہر سمت گہرا سناٹا۔

رات کو اس نے بھوک نہ ہونے کی بنا پر کھانا بھی نہیں کھایا۔ نانی کے ہاتھ کی مالش کر رہی تھی تو ماموں کچھ ڈھونڈتی نظروں سے ادھر ادھر تکتے اندر داخل ہوئے۔

"بھئی۔ وہ مٹھائی کدھر ہے؟ سنا ہے بڑی تازہ اور لذیذ مٹھائی لائی ہو۔ مگر چکھے بغیر تو ہم نوید کی بات کا یقین نہیں کریں گے۔"

وہ باتھ روم جا کر ہاتھ دھو کر آئی۔ پھر مٹھائی ان کے سامنے لا کر رکھی اور دبی زبان سے بولی۔

"ماموں۔ ممانی نے تو مٹھائی کھائی ہی نہیں۔"

"ارے تو ہم کھا لیتے ہیں ان کے حصے کی بھی۔ تم نے سنا نہیں۔ بندر کیا جانے ادرک کا مزا۔"

"ماموں! ممانی مجھ سے بہت خفا ہیں۔"

"ارے لڑکی! واہ۔ کیا لذیذ مٹھائی ہے۔" وہ اس کی بات ان سنی کر گئے۔ "بھئی یہ امرتسر والوں کی تو ہے نہیں۔ یہ جالندھر والوں کی ہے۔ کوئی نئی دکان سے لائی ہو کیا؟"

وہ ان کے قدموں میں بیٹھ کر ٹسر ٹسر رونے لگی۔

"ارے۔ کیوں رو رہی ہے باؤلی۔"

"میں کچھ نہ کروں۔ تب بھی قصوروار ٹھہرائی جاتی ہوں۔" وہ بھرے گلے سے شکوہ کر رہی تھی۔

"فکر نہ کرو۔ ہر رات کی صبح ہوتی ہے۔ اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوتا ہے۔ اور صبح کا اجالا بڑے آرام سے رات کی سیاہی سے کر الگ ہوجاتا ہے۔ پونچھ لے آنسو۔ تیری ماں کو بھی آنسو بہانے میں بڑی مہارت تھی۔ کیوں اماں۔"

اماں نے سرد آہ بھری۔

"ہاں۔ ایک ذرا سی کوتاہی مجھ سے ہوئی۔ زبردستی بھی کرلیتی تو کوئی کچھ۔ کر نہیں سکتا تھا مگر مجھے امید نہ تھی کہ بھائی جان اپنی پھول سی بیٹی کو۔ ناقدروں کے حوالے کردیں گے۔ ساری زندگی روتے روتے گزری اس کی۔ انجان ماحول۔ بیگانی فضا۔ شہری لڑکیوں کے تعصب۔ آہ۔ ہیرا مٹی میں رل گیا۔"

"اماں! ہم اس ہیرے کو مٹی میں رلنے نہیں دیں گے۔" ماموں نے بڑے تیقن سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور مٹھائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"انجو! یہ مٹھائی کا ڈبہ اٹھا کر الماری میں رکھ۔ یہ تو کھاتا ہی چلا جائے گا۔ بعد میں کچھ ہوگیا تو۔"

"اماں!" ماموں لاڈ میں آکر بولے۔ "خوشی کی مٹھائی نقصان نہیں، فائدہ کرتی ہے۔ اور مجھے تو سیر بھر مٹھائی کھانا ہے ابھی۔ بیٹے، بیٹیوں کی خوشیوں کی۔"

"اچھا۔ اچھا۔ کھا لینا۔ مگر رات میں اتنی مٹھائی فائدہ نہیں دیتی۔ کچھ اپنی صحت کی بھی فکر کرلیا کر۔"

"نانی! مجھے یونیورسٹی کے قریب گھر مل گیا ہے۔" انجو نے مٹھائی اندر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتی ہوں۔ جاتے سے پہلے ممانی اگر مجھے معاف کردیں۔ حالانکہ قصور تو میرا نہیں ہے۔"

"کسی کی پروا نہ کر۔" ماموں نے سختی سے کہا۔

اگلے دن صبح وہ جا رہی تھی تو اس نے دیکھا۔ لان کی گھاس ویسی ہی سرسبز ہے۔ ہارسنگھار کا پیڑ مزید گھنا ہوگیا ہے۔ اس میں پھول بھی لگے ہیں۔ فرش پر گرے بھی ہوں گے۔ وہ زرد ڈنڈی کے سفید پنکھڑیوں والے پھول۔ وہ جو اک یاد میں جگنو کی طرح چمکتے۔ اور بس۔ ان پھولوں کی مہک ہوا سے ادھر ادھر تو بکھرتی تھی۔ مگر باقی نہیں رہتی تھی۔ وہ نظر چرا کر گیٹ کی طرف چل دی۔

کئی دن تک انجو نہیں آئی۔ تو دادی کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے نوید سے کہا۔

"بیٹا جا کر انجو کی خبر لا۔ پھپھو کے گھر ہو گی۔ یہاں کیوں نہیں آئی؟"

"میں؟ دادی میں جاؤں خبر لانے؟ کسی کبوتر کو کیوں نہیں بھیج دیتیں نامہ بر بنا کر۔"

"کیوں۔ تم کو اس کی پھپھو کے گھر کا پتا نہیں۔"

"آہ۔ کیا بات کرتی ہیں آپ۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "کیوں نہ ہو گا پتا۔ یار کی گلی کے سارے نمبر معلوم ہیں۔ ایک پھپھو کے گھر کی کیا بات ہے۔"

"دیکھ۔ دیکھ نوید۔ مجھ سے بدتمیزی نہ کر۔ نہیں جاتا۔ تو نہ جا۔" وہ خفا ہو گئیں۔ وہ فوراً دادی کے شانے دبانے لگا۔

"ہاں۔ دادی۔ پھر کیا کہنا ہے۔ کیا کہلانا ہے کچھ آپ لکھ کر دے دیں۔ کچھ میں زبانی پیغام دے آؤں۔"

"بس رہنے دے۔ مجھے کچھ لکھ کر نہیں دینا۔ تیرا باوا خود پتا چلالے گا۔"

"یہ بات کی ہے قاعدے کی آپ نے۔ جو کام اوپر سے ہو جائے وہ مضبوط بنیاد قائم کرتا ہے اسے کہتے ہیں تھرو پراپر چینل۔"

"جنے کیا بک رہا ہے۔"

"بکرا تو کہیں سے نہیں ہوں۔ آدمی ہوں چلیے چلا جاتا ہوں آپ کے حکم کی تعمیل میں۔"

"یہ کہاں جانے کی بات ہو رہی ہے۔ ابھی آئے دیر نہیں ہوئی۔" امی پتا نہیں کس کام سے کمرے میں آئی تھیں۔

"ارے وہی۔ میں کہہ رہی تھی کہ جا کر خبر لا۔ یہ پتا نہیں کہاں کی ہانک رہا ہے۔"

"او۔ او۔ دا۔ دی۔" وہ چلایا۔

"کس کی خبر۔"

"ارے وہی۔ انجو۔ ذرا پھپھو کے گھر چلا جائے مگر اس گھر میں میری کون سنتا ہے۔"

"آہ۔ سب راز افشا کر دیا۔ اف اب میں کہاں جاؤں۔" وہ سر پر ہاتھ رکھ کر دھم سے پلنگ پر گرا۔

"کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے باوا سب خبر رکھتے ہیں۔ وہ اس گھر میں منتقل ہو گئی ہے۔ جو اسے الاٹ ہوا ہے۔"

"کہیے کہ یونیورسٹی کی طرف سے جو بنگلہ دیا گیا ہے۔" وہ جیب سے کنگھا نکال کر اطمینان سے بال بنانے لگا۔

"اونہہ۔ اب اتنی بھی اہم ہستی نہیں کہ بنگلہ دیا جائے گا۔" امی کا منہ ٹیڑھا ہو گیا۔ موڈ تو خراب تھا ہی۔

"دیکھا دادی! کس آسانی سے آپ کا کام ہو گیا۔" اس نے مڑ کر دادی کو دیکھا۔ پھر ہنس کر بولا۔ "مجھے زحمت کرنی نہیں پڑی۔"

"ارے مگر مجھے تو فکر پڑ گئی۔ اکیلی جوان جہان لڑکی۔ کیسے رہے گی۔" دادی بہت پریشان ہو گئیں۔

"اماں۔ جیسے سب بے غیرت لڑکیاں رہتی ہیں اسی طرح رہتی ہو گی۔" امی کو اپنی ساس کا بھی لحاظ نہ رہا۔ "یہ چادر اوڑھ کر ہم جیسوں کو بے وقوف بنانے والیاں۔ ارے کہیں حیا ہوتی ہے۔ ان کے پاس۔ کل احتشام پر ڈورے ڈالتی رہی۔ اب ہمارے صاحبزادے ان کے چکروں میں آ گئے۔"

انہوں نے نہایت تیز جلتی ہوئی نظر نوید پر ڈالی۔ جو اُن کے پہلے جملے کے شروع میں ہی غصے میں آ گیا تھا۔ اس پر ماں کی وہ کڑوی نگاہ۔ طیش کے عالم میں اس نے کنگھا دیوار پر دے مارا۔

"آپ کو جو علم نہیں وہ میں بتا دیتا ہوں۔ کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس کی امی آ گئی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک دیہاتی چوکیدار اور ملازمہ بھی آئی ہے۔ اور میں بھی جاتا ہوں وہاں۔ بس؟"

کہتا ہوا دھم دھم کرتا پیر مارتا وہ کمرے سے نکل گیا۔

"دیکھ لیا آپ نے اس کا غصہ اور طنطنہ۔" وہ ساس کی طرف مڑیں۔ "اسے سب خبر تھی۔ بن رہا تھا جیسے بڑا معصوم ہو۔ سچ بات کیسے جا کر لگی۔ دل میں آگ لگ گئی۔"

"شبانہ!" ساس نے غضبناک ہو کر ان پر آگ اگلتی نظر سے دیکھا۔ "کیسی ماں ہو تم۔ اپنے بیٹے۔ اپنی اولاد کے لیے یہ الفاظ کہتے ہوئے تمہارے

ہونٹ کیوں نہ جل گئے۔ ارے جوان بیٹے کے دل میں آگ لگا کر خوش رہ سکتی ہو تم؟ توبہ کرو شبانہ۔ توبہ کرو۔"

وہ دل ہی دل میں ساس سے بھی خفا ہو گئیں۔ الفاظ ہی تو ہیں۔ میں نے کون سا آگ کا شعلہ اس کی طرف پھینکا تھا جو اماں کے دل کو بھی راکھ کر گیا۔ ان کی خاموشی پر ساس کو مزید غصہ آیا۔

"ساری زندگی تم نے میرے بچوں کے ساتھ ناانصافی کی۔ میرے بیٹے کی کسی خواہش کا احترام نہ کیا۔ گھر میں جھوٹ اور تصنع کا رواج ڈالا۔ شکوک اور تلخ بیانیوں سے گھر کا ماحول مکدر کیے رکھا۔ سسرال والوں سے دوری کی خاطر سب سے بگاڑ قائم کیا۔ خوامخواہ کا ہتوا کھڑا کرنے کی تم کو مہارت ہے۔ اخلاق نے اسی لیے مجھے بلا کر اپنے پاس رکھا۔ غلطی میں کچھ کمی ہو۔ ارے۔ میرا بیٹا۔ ایسا خوش مزاج۔ ہشاش بشاش تھا۔ تمہارے ساتھ رہ کر مرجھا گیا۔ کاش کہ میں نے شروع میں تم کو ٹوکا ہوتا۔ سختی کی ہوتی۔ تو آج تمہارا مزاج اور زبان اتنی بے قابو نہ ہوتی۔"

بہو ششدر سی اپنی الگ تھلگ رہنے والی ساس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تو کبھی کسی معاملے میں نہ بولی تھیں۔ آج ان کو ہوا کیا ہے۔

"کتنی غلطیاں کی ہیں میں نے۔ اور ہر غلطی کی سزا میرے اخلاق کو ملی۔"

اماں اب آواز اور لہجہ ہلکا کر کے بولنے لگیں ایک پچھتاوا۔ ملال۔ اور کوفت سے بھرا لہجہ۔

"ایک غلطی صبورہ کو ٹھکرا کر کی تھی۔ مگر دوسری غلطی۔ تمہیں لا کر کی۔ جس نے اخلاق کی پوری زندگی پر اندھیرے برسانے کی پوری کوشش کی۔ ہائے میں کیسی اندھی تھی۔ شبانہ۔ آج وہ بات کہہ رہی ہوں۔ جو منہ میں ہی رکھی تھی۔ صرف اس لیے کہ تم بھی ماں ہو۔ کسی ماں کو اس طرح شرمندہ کرنا میرے مزاج میں شامل نہیں۔ شبانہ۔ دراصل تم اس گھر کے قابل تھیں ہی نہیں۔ اگر صبورہ ہوتی تو یہی گھر جنت ہوتا۔"

اماں کی ڈانٹ اب پھٹکار میں بدل گئی۔ اور شبانہ ضبط کے آخری مرحلے میں بے قابو ہو کر اپنے کمرے میں بھاگ گئیں۔ انہوں نے ساس کو کبھی اس قابل سمجھا ہی نہیں کہ ان سے کوئی رائے مشورہ لیتیں۔ یا بزرگ سمجھ کر کچھ حاصل کرتیں۔ ان کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتیں یا کچھ سیکھتیں۔ انہیں تو شوہر کو قابو کرنے کا شوق تھا۔ اس کے لیے تعویذ بھی لاتیں۔ گھول گھول کر انہیں پلاتیں۔ گھر پر راج کرنے، حکومتی احکامات صادر کرنے کا جنون انہیں بہت دور لے گیا تھا۔ کافی عرصہ پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے مشن میں ناکام رہی تھیں گھر پر ان کا راج تھا۔ مگر اس میں بھی پہلے ساس رخنہ اندازی کرتی تھیں اب اولاد۔

اخلاق صاحب نے شروع میں تو ان کے ناز اٹھائے۔ پھر ان کی تنگی فطرت سے بیزار ہو گئے۔ یوں وہ ان کے سامنے کیا گھر میں عموماً خاموش رہتے۔ مگر اماں کے کمرے میں پہنچتے ہی کینچلی بدل لیتے۔ بچوں کو بھی وہیں بلا لیتے۔ ہنستے بولتے کھاتے پیتے ہلا گلا کرتے۔ اس وقت کسی اولاد کو ماں کا خیال نہ آتا۔ کسی کو آتا بھی تو دوسرا "انہیں پسند نہیں ہے ہمارا شور شرابہ" کہہ کر خاموش کرا دیتا۔

اور کافی عرصے سے گھر میں ان کے خلاف کچھ ہو رہا تھا۔

معید ان کی مرضی کے خلاف باہر بھیجا گیا۔

نوید کے لیے انہوں نے کتنا سر مارا۔ اس نے نوکری کر کے نہ دی۔ پیسہ اڑانے کا شوق۔

وہ نہیں چاہتی تھیں کہ انجو اس گھر میں آئے۔ بچوں کے دلوں میں بھی انہوں نے اس کے خلاف تحقیر کے جذبات بیدار کیے۔ اس کے آنے سے اخلاق کو اپنی بچھڑی محبت یاد آ جاتی ہوگی۔ یہ خدشہ ان کے صبر و قرار کو غارت کر دیتا۔ پھر بھی وہ بے غیرت بن کر ہر سال آ جاتی۔ یہ تو اب پتا چلا کہ اس میں اخلاق کی خط و کتابت کا دخل تھا۔ اخلاق ان کی مرضی کے خلاف ہر کام کر لیتے۔ حد تو یہ کہ ندا کے رشتے کے سلسلے میں جب انہوں نے اعتراض کیا تو۔

"بحث کی گنجائش نہیں ہے۔"

کہہ کر بات ختم کر دی۔ صبا کی بات آئی تو پوری تقریر جھاڑ دی۔ بہت سی باتوں کی تو ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ انجو کے باپ کے مرنے کی خبر گھر میں تو کئی دن بعد ہوئی۔ وہ اس کے جنازے میں شرکت کے لیے گاؤں پہنچ گئے۔ اور اگر بتایا تک نہیں۔ اتنا گھنا شخص ہے اور پھر نوید کو سامنے بٹھا کر لیکچر دیتے رہے۔ جس میں رشتوں کی زنجیر، مہر مروت رواداری۔ اور تعلقات۔ جیسے بے شمار خوبصورت دلکش الفاظ تھے۔ جن کی اب دنیا میں کوئی قدر۔ نہ کسی کو ان کی ضرورت۔ یا چاہت۔ مگر نوید بغور سنتا رہا۔

بیوی کی بددلی کے باوجود سناتے رہے۔ بتاتے رہے کہ جب وہ گاؤں پہنچے۔ تو ماتم والے گھر میں ان کا کس قدر پرتپاک خیر مقدم اور عزت کا مقام انہیں دیا گیا۔ کہ وہ شرمندہ ہو گئے۔ وہ بھی انجو اور اس کی ماں سے کہہ آئے۔

"کہ میرا گھر موجود ہے۔ اور اماں ابھی زندہ ہیں جو تمہیں ماں کا پیار دیں گی۔ اسے میکہ سمجھ کر جب جی چاہے آ جانا۔ میرے گھر کو اپنا گھر سمجھو۔"

وغیرہ یہ سب نوید کو تفصیل سے سنایا گیا۔ اور نوید کی افتادِ طبع کا یہ حال۔ کہ ماں چاہے رو رو کر خوشامد کریں۔ مجال ہے اس کے کانوں پر جوں رینگ جائے۔ اور باپ کی انگلی کا اشارا حکم کا درجہ اب یہی دیکھو کہ۔ بے باکی سے کہہ دیا کہ میں بھی اس کے گھر جاتا ہوں۔ احتشام بھائی تو ان کا ہے۔ مگر عنایات اخلاق صاحب کی۔ کہ فوراً اقرار۔ فوراً نکاح کی وہی تاریخ جو ندا کی رکھی گئی۔ یعنی آج بھی وہ پوری کوشش کے باوجود خالی دامن تھیں۔ کہ ان کی کوئی بات نہ مانی گئی۔ کہیں مرضی نہ چل۔

آج تو ساس نے بھی اپنے اختیار کو استعمال کر کے انہیں بے بھاؤ کی سنا ڈالیں۔ میں اپنے بیٹے کے لیے الفاظ بھی ان کی مرضی کے استعمال کروں۔ واہ میری کوئی اہمیت نہیں حق نہیں۔ انہوں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ہر جگہ۔ ہر دفعہ۔ ہمیشہ ہی جب اور برتری کی خواہاں ہوئیں۔ اخلاق ان سے لاپروا ... وہ کم آمدنی اور مالی مشکلات کے رونے روتیں۔ بچت کرتا چاہتیں۔

اخلاق سب پر نوازشات عنایات کر کے انہیں جھوٹا بنا دیتے۔ کسی غریب لڑکے کو تعلیم دلائی جا رہی ہے۔ کسی بیوہ کا وظیفہ بندھا ہوا ہے۔ کسی کم آمدنی والے کے گھر کے بجلی کے بل ادا کر رہے ہیں۔ تو کسی بچے کے خرچے پورے کر رہے ہیں۔

آج شبانہ کو گزرے ہوئے زمانے کی کتنی ہی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ مگر پہلے انہیں اس کا اندازہ ہی نہ تھا کہ یہ ان کے خلاف ہو رہا ہے۔ وہ تو اسی زعم میں مبتلا رہیں کہ گھر پر بلا شرکت غیرے ان کا راج ہے۔ شوہر کا منہ تعویذوں نے بند کر دیا ہے۔ ساس کو بھی تعویذوں کی برکت نے الگ تھلگ کر دیا ہے۔

یاد آیا کہ صبا پیدا ہوئی تو اس کے نام پر ساس نے جھگڑا کیا۔ وہ اس وقت کی مشہور ہیروئن کے نام پر صبا کا نام رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ ہیروئن انہیں پسند تھی مگر ساس نے وہ واویلا مچایا کہ انہیں چپ ہونا پڑا۔ وہ بمشکل صبا پر راضی ہوئیں ورنہ کہتی رہیں۔

"بھئی یہ ہوا۔ پانی۔ بلبلہ کیسے نام ہیں۔ نام ایسے ہوں جن کا اثر پوری زندگی پر محیط ہو۔ ہم نے تو چھانٹ چھانٹ کر اپنے بچوں کے اچھے نام رکھے ہیں بڑا زعم تھا انہیں کہ سب کے نام بامعنی نیکی اور شرافت سے مزین ہیں۔ اخلاق ہی کو دیکھا۔ پورے خاندان میں اس کے اخلاق کا چرچا ہے۔ ہوگا چرچا۔ سسرال میں وہ "مزاج دار داماد" کے لقب سے یاد کیے جاتے۔ بہت لیے دیے رہتے، سالوں سے کبھی بے تکلف نہ ہوئے۔

شبانہ کے والدین ان سے دبتے تھے کہ خاندانی رئیس کسی بات کا برا نہ مناتے۔ کبھی کسی سے کھل کر بات نہ کرتے۔ ہاں ایک دو کو شرف گفتگو بخش دیا کرتے۔

ایک بار ان کے خاندان کی کسی تقریب میں وہ سلامت علی سے گپ شپ کر رہے تھے۔ کھل کر باتیں اور قہقہے۔ سلامت علی اس کو اپنی عزت افزائی سمجھ رہا تھا۔ اور یہ سلامت علی انتہائی بدذوق اور ڈرا تھا۔

بدتہذیب۔ اس نے شبانہ کے ساتھ تین سال کی منگنی اپنی کلاس فیلو کی خاطر توڑ دی۔ شبانہ کو یاد تھا ان دنوں وہ سلامت علی کو دن رات کوستی اور ان کی ازدواجی زندگی کے خاتمے کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ مگر نہ صرف کمبخت کی بیوی آج تک زندہ سلامت تھی۔ بلکہ ان کی ازدواجی زندگی بھی مثالی تھی۔

—— تقریب سے آکر انہوں نے تیکھی نظروں سے اخلاق کو دیکھ کر پوچھا۔

"سلامت علی سے اتنی دیر کیا باتیں کرتے رہے؟"

"بس۔ گپ شپ۔ ادھر ادھر کی۔"

"پھر بھی۔" وہ جواب کی منتظر تھیں۔

"میں اس کی خوش قسمتی پر اسے مبارکباد دے رہا تھا۔ اور اس کی پسند پر عش عش کر رہا تھا۔"

انہوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ کہیں سے یہ پتا نہ چلتا تھا کہ وہ طنز کر رہے ہیں۔ خوش قسمتی پر مبارکباد۔ شبانہ سے منگنی توڑ دینا بھی ہو سکتی تھی اور۔ اس کی پسند کی شادی بھی۔ وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

یہ صحیح تھا کہ ان کے والدین کو اتنے بڑے گھرانے میں شادی کی امید نہ تھی۔ مگر ہونی ہو کر رہتی ہے وہ بہو بن کر آئیں تو احساس کمتری میں مبتلا ہو گئیں۔ پھر ساری زندگی برتری کی کوششوں میں گزر گئی۔

شادی کے بعد جب انہیں اخلاق کی زندگی کی اس ٹریجڈی کا علم ہوا۔ جس کا تعلق ان کی خالہ زاد صبورہ سے تھا۔ مگر جو عین وقت پر ان کی نہ بن سکی۔ اس کے باپ نے اپنے خیال میں بہتر رشتہ دیکھ کر اسے ایک زمیندار سے بیاہ دیا۔ اور جس کی ساری زمینیں گروی تھیں۔ وہ خود قلاش تھا مگر اس کی تباہ حالی بہت دن بعد ظاہر ہوئی۔ اور یوں صبورہ جاہل شوہر کے ظالمانہ طرز عمل کی شکار رہی۔

وہ دل ہی دل میں صبورہ کو کوستی اور اس کے بڈھے شوہر کے لیے زندگی کی دعائیں کرتی رہتی تھیں آج تک اخلاق شبانہ کی کسی خوبی کا یوں اعتراف نہ کر سکے۔ جیسا کہ صبورہ کی تعریف و توصیف۔ ہائے یہ ہے میرا مقام اس گھر میں۔ ساس نے بھی آئینہ دکھا دیا۔ زندگی اس گھر کی بہبود کے لیے وقف کر دی۔ اور یہ صلہ ملا؟ عورت کتنی بے بس ہے۔

کئی دن ان کی ساس کے ساتھ سرد جنگ چھڑی رہی۔ نہ شوہر نے پوچھا۔ (اور وہ کب پوچھتے تھے) نہ بچوں کو ہی خیال آیا۔ دادی، پوتے، پوتیاں ایک دوسرے پر حسب معمول مہربان۔ وہی الگ تھلگ چپ چپ رہیں۔

کسی کو ان کا خیال ہی نہ تھا۔ یہ کیسی ناقدری تھی۔

"آپا۔ کئی دن سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔" ندا نے ہچکچاتے ہوئے صبا سے نظر چرا کر دیوار گھورنی شروع کر دی۔

"ارے۔ کیا بات ہے۔ کہو ناں۔" صبا کو ہنسی آگئی۔

"وہ۔ آپا۔ میں۔ میں نے۔ ماموں کو۔ دراصل امی نے مجھے ان کی طرف متوجہ کیا تھا۔"

صبا نے پیار سے اسے پکڑ لیا۔ "میں جانتی ہوں۔ میں نے تم سے کوئی بات کی۔ وہ قصہ اب ختم ہو گیا۔"

"مجھے خیال آیا کہ۔ آپ کو بھی۔"

"نہیں۔ ندا میں امی کی پالیسی جانتی ہوں۔ انہوں نے سوچا تھا۔ میں تو سجاد کے نام پر بک ہو چکی ہوں۔ ندا کے لیے احتشام اچھا رہے گا۔ قریب کے قریب۔ ایک بیٹی اگر دور ہو گی۔ دوسری تو پاس رہے گی۔"

"نہیں آپا۔ امی نے تو چاہا تھا کہ۔ کہا تھا کہ اس سے پہلے کہ انجو یا ماذا اسے قابو کر لیں۔ تم۔ آپا۔ امی چاہتی ہیں کہ ہر اچھی چیز ہمارے پاس ہونی چاہیے خواہ کسی کا حق مار کر ملے۔ یہ اچھی بات ہے کیا؟"

"نہیں۔ دیکھو ابا جان کیا کہتے ہیں۔ اپنا حصہ بھی دوسروں کو دے دو۔ اگر اپنی خواہشات پر قابو پا لو تو اس سے ضمیر بڑا مطمئن رہتا ہے اور خود پر فخر ہوتا ہے۔ کہ اگر ہم نے کسی کو فائدہ نہ بھی پہنچایا مگر کسی کا نقصان بھی نہیں کیا۔ اور بعض دفعہ خود بھی فائدے میں رہتا ہے آدمی۔"

"کیا آپ۔ اسی لیے۔ دوسروں کو دیتے میں دیر نہیں لگاتیں؟"

"پتا نہیں۔ میں تو اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہی کرتی ہوں۔ اچھا۔ یا برا۔ کہہ نہیں سکتی۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ۔ کسی کو میری جانب سے اذیت نہ پہنچے۔"

"اور امی۔ دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوش ہوتی ہیں۔ بھائی سے اسی لیے خفا ہیں کہ۔ وہ ابا جان اور دادی کی بات مانتے ہیں۔ ان سے اختلاف کرتے ہیں۔"

"ہم کیا کر سکتے ہیں۔" صبا نے بات ختم کرنے کے لیے کندھے اچکائے۔

"اور آپا۔ پتا ہے انجو آپا سے امی کو کس لیے نفرت ہے؟ کہ وہ صبورہ آنٹی کی بیٹی ہیں۔ جو ابا جان کی ہونے والی۔ حالانکہ اب تو۔"

"اچھا۔ اچھا۔ زیادہ لقراطی کی ضرورت نہیں۔ چپ ہو جاؤ۔ بہت سی باتیں ہمیں دل میں ہی دبا دینی چاہئیں۔ یہ ابا جان کی تعلیم ہے۔ جس کا تم پر سب سے کم اثر ہوا ہے۔"

"پتا نہیں۔ یہ ابا جان اور امی جان کی تعلیم میں اتنا فرق کیوں ہے۔" ندا فکر مند تھی۔

"امی۔ کئی دن سے چپ چپ ہیں۔"

"انہیں۔ دونوں رشتے پسند ہیں۔ اگر ان کی ترتیب الٹ جاتی تو انہیں اعتراض نہ ہوتا۔" ندا شرارت سے بولی۔

"حالانکہ مجھے امریکہ اور ڈالرز سے دلچسپی نہیں۔ اور تمہیں سیر و تفریح بہت پسند ہے۔"

"امی کو اپنی ضد کے سامنے۔ تجزیہ کرنا فضول لگتا ہے۔"

اس دن ندا نے ماں کے کمرے میں جھانک کر کہا۔

"امی۔ چلیں جیولر سے سیٹ لے آئیں۔" ندا امی کی پسند سے شاپنگ کرتی تھی۔ گو کہ رخصتی میں ابھی کئی ماہ تھے مگر نکاح کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔

انہوں نے اٹھنے میں سستی سے کام لیا پھر بھی جانا تو تھا۔ جیولر کے ہاں دیر لگی۔ سیٹ تیار نہ تھا پھر انہوں نے دوسری دکان سے بھی شاپنگ کر لی۔ گھر آئیں تو اخلاق کی آواز سنی۔ اس وقت۔ آفس ٹائم میں اخلاق گھر پر؟ انہوں نے ساس کے کمرے میں جھانکا۔

اماں کے پلنگ پر سر جھکائے۔ اپنی انگلیوں کو گنتی ہوئی۔ وہ ان کی رقیب خاص۔ انجو کی ماں صبورہ تھی۔ اماں نے دیکھ لیا۔ اور اتنے دن کے بعد انہیں پکار لیا۔

"شبانہ۔ آؤ۔ دیکھو یہ آئی ہے۔ بدنصیب۔ آؤ۔ اسے پرسہ دو۔"

"پرسہ دینا اتنا ضروری ہے۔" وہ چڑ گئیں مگر ساس سے جو کشیدگی چل رہی تھی اسے ختم کرنے کا بہانا مل گیا۔ طوعاً و کرہاً وہ اندر آئیں۔ وہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو اس کی کشیدہ قامتی کا پہلی بار اندازہ ہوا۔ انہوں نے اسے گلے لگایا (مجبوری) پیٹھ تھپکی وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ انہیں بھی آنکھیں مسلنا پڑیں۔ (مجبوری)

"اب بس بھی کر۔ کتنا روئے گی صبو۔ جب سے آئی ہے صورت بنا رکھی ہے۔ تیرا دل نہیں بھرتا۔" اماں خفا ہوئیں۔

"خالہ جان! آج پہلی بار روئی ہوں دل کھول کر۔ اپنوں کی صورت ہی آج نظر آئی ہے۔"

"ہونہہ۔ فضول کی تھکن۔ جس کا وقت آتا ہے وہ چلا جاتا ہے۔ کون سا جوان تھا وہ۔ تیری جوانی البتہ خاک میں ملا دی اس نے۔"

شبانہ چونک گئیں۔ یہ کیسی باتیں ہیں۔ اپنوں کی صورت آج نظر آئی ہے۔ اور جوانی خاک میں ملا دی اس نے۔ وہ شکل سے تھکن ظاہر کرتی اپنے کمرے میں آکر ڈھے گئیں۔ اخلاق سے اتنا نہ ہوا کہ آکر بیوی کا حال پوچھ لیتے۔ اونہہ۔ سب اخلاق ظاہر مگر اسے لایا کون۔ ظاہر ہے اخلاق لائے ہوں گے۔ آفس ٹائم میں اگر میں کسی کام کا کہہ دوں، فوراً "نہ" ہو جاتا ہے۔ وہ تصدیق کی خاطر پھر ساس کے کمرے میں آگئیں۔

"انجو کہاں ہے۔ کیا اکیلی آئی ہو؟"

"انجی کو بھلا فرصت کہاں۔ وہ تو صبح کی گئی سہ پہر کو آتی ہے۔ اتنا کام کرنا پڑتا ہے بھائی!"

"کیوں؟ پڑھاتی نہیں؟ کوئی اور کام کرتی ہے؟" وہ تو پہلے ہی مشکوک تھیں۔

"پڑھاتی بھی ہے۔ اور جو رسالہ ہے اس کی ایڈیٹر بنا دیا ہے۔ اور — مباحثے وغیرہ جو ہوتے ہیں۔ ان میں بھی۔ طلبا طالبات کی قابلیت کا ٹیسٹ اسے لینا پڑتا ہے۔ کہ کون شریک ہو۔ کون نہیں۔"

(اونہہ۔ لن ترانی۔ تم آئی کس کے ساتھ ہو۔)

ظاہر ہے اخلاق کے مگر تصدیق ضروری۔

"نوید بیٹا لے کر آیا ہے۔ میں تو پہلے ہی آتی مگر طبیعت خراب ہو گئی۔"

"آپ — یہاں کیسے اس وقت؟" اب اخلاق کی باری آگئی۔

"میں گیا ہی نہیں۔ ارے بھائی۔ کچھ دکھیاری نند کی خاطر تواضع بھی کرو۔ کہ تفتیش ہی کرتی رہو گی۔"

"خاطر تواضع — کیا لڑکیوں نے۔ کوئی خاطر نہیں کی۔" تفتیش کا لفظ تیر کی طرح دل میں کھبا۔

"دو ہی تو لڑکیاں ہیں آپ کی۔ ایک کو آپ لے گئیں۔ ایک بعد میں احتشام کا فون آتے ہی چلی گئی۔"

"صبا کیوں چلی گئی؟" نند کے سامنے وہ اس آزادی کے ذکر کو کیسے پسند کرتیں۔ ندا کو پکارتی ہوئی چلی گئیں۔

شام کو وہ یوں بے چین تھے۔ جیسے ان کا نہ جانے کیا کھو گیا ہے۔ کبھی اندر آتے۔ پھر باہر جاتے۔

"کیا کھو گیا ہے آپ کا۔ کیا چیز تلاش کر رہے ہیں؟"

"ہاں۔ میرے ماہ و سال کھو گئے ہیں۔ انہی کو تلاش کر رہا ہوں۔" چہرے پر فکر و اندوہ کے انبار سجا کر فرمایا۔

"بڑی دیر بعد خیال آیا۔" وہ بھی طنز سے باز نہ آئیں۔

"دیر آید۔ درست آید۔"

وہ جل بھن کر کوئلہ ہو گئیں۔

"نوید ابھی تک نہیں آیا۔ کہا بھی تھا کہ جلدی آنا۔ اب صبو کو جانا ہے۔ ٹیکسی پر جا رہی ہے۔ میں چھوڑ آتا ہوں۔"

کہہ کر عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چلے گئے۔

بالکل راکھ ہو گئیں۔ کہا ہی نہ ہوگا نوید سے۔ اداکاری محض۔ یہ مرد۔ اُف یہ مرد۔ بڑھاپا بھی ان کے شوق کو نہیں مٹاتا۔

صبو۔ اللہ رے دلار۔ اب پرانی محبوبہ سے راز و نیاز۔ اونہہ مجھے کیا۔ میرے بچے سلامت رہیں۔ پہلے سے آنے کی اطلاع ہو گی۔ تبھی آفس نہیں گئے۔ نوید سے تو بات کرنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ اس سے تصدیق کرنا ہی بیکار تھا۔ وہ تو باپ کو بچانے والی بات گھڑ کر سنا دے گا۔

صبا آئی۔ تو سارا غصہ اس پر انڈیل دیا۔ احتشام ان کے لیے اب بھی ایک طعن۔ ایک تیر تھا۔ اور صبا کے اس اقدام پر انہیں اس سے چڑ ہو رہی تھی اس نے بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوری کر لیا۔ پھر آرام سے بات بتائی۔

وہ ابا جان سے اجازت لے کر گئی تھی۔ احتشام کی امی کو تیز بخار تھا۔ ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے احتشام نے پڑوس میں فون کیا۔ پڑوسن نے بتایا۔ کہ وہ بے ہوش ہیں۔ احتشام نے نوید کو فون کیا۔ وہ اپنی سیٹ پر نہ تھا۔ (ہاں وہ تو اپنی صبو آنٹی کی چاکری میں ہو گا) پھر انہوں نے گھر فون کر کے صبا سے کہا کہ اسے زحمت نہ ہو تو ان کے گھر چلی جائے۔

وہ نوکر کو ہمراہ لے کر گئی تھی۔ ابا جان نے خود کہا تھا نوکر کو لے کر جاؤ۔ ڈاکٹر کو بلانا پڑا تو وہ بلا لائے گا۔"

(اور مجھے موصوف نے کوئی تفصیل ہی نہ بتائی۔ صبو کی موجودگی میں سب کچھ بھلا بیٹھے۔)

"کیا تم ابھی سے ان کی خدمت پر مامور ہو گئی ہو؟ یہ نخرے تو — کیسے اٹھاؤ گی؟ اسی لیے ماذا بھاگ گئی۔"

"امی!" صبا نے ٹھہرے ہوئے انداز میں سمجھانا چاہا۔ "اگر ماذا کی موجودگی میں بھی کوئی مجھ سے کہتا۔ تو میں چلی جاتی۔ یوں بھی وہ گھر میں اکیلی ہیں۔ اور آپ کی بچی ہیں۔ کسی کے کام آنا۔ کسی کی خدمت کرنا بہت اعلا مقصد کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ میرا فرض بھی ہے۔ انجو بھی تو جتنے دن یہاں آکر رہتی ہے

دادی کے اور آپ کے سر پیر کی مالش کرتی ہے۔ پیر دباتی ہے۔ سب کے کام کرتی ہے۔"

"اس — اس کا نام مت لو میرے سامنے۔" وہ چیخ پڑیں۔ "اُف سب کو اس کے اس کی ماں کے ذکر کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔"

"کیوں؟" صبا بے حد تعجب سے بولی۔ "ابا جان نے آپ کو بتایا نہیں۔ نوید اور انجو کی تو منگنی ہونے والی ہے۔"

شبانہ کے ہاتھ سے ان کا قیمتی چشمہ زمین پر گرا۔ سب کچھ جائے بھاڑ میں۔ مگر اخلاق کی یہ جرأت کہ نوید کی شادی ان کی مرضی کے خلاف ہو۔ اور انہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا جائے۔ "کب بات ہوئی یہ۔ کس نے دیا رشتہ۔" وہ سر لپیٹ کر لیٹ گئیں۔

صبا کے لیے ان کا یہ طرز عمل خاصا حیران کن تھا۔ نوید نے تو اسے رات ہی بتا دیا تھا۔ ابا جان کو ظاہر ہے یہ رشتہ پسند تھا۔ وہ اب نوید پر خاصے مہربان تھے بلکہ اس کی خواہش کے مطابق ہر کام کرنے لگے تھے۔ مگر ابا جان نے امی سے ذکر کیوں نہیں کیا۔ وہ تو بہت خوش تھی۔ انجو کے ساتھ جو زیادتی ان کے گھر میں ہوئی تھی اس کا ازالہ بھی خود بخود ہو جائے گا۔

ابا جان نے سب کو لاؤنج میں جمع کیا۔ معید تو امریکا میں تھا۔ اس کے سوا سب اکٹھے ہو گئے۔ اور خوش گپیاں شروع۔ جب سب بیٹھ گئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ نوید کے لیے انجو کا انتخاب ہوا ہے۔

(کس نے کیا انتخاب۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں)

بچوں نے تالیاں بجا کر ہُرے کے نعرے لگا کر داد دی۔

"میں نے تمہاری صبو آنٹی سے بات کی۔ انہوں نے تو سوچنے کی مہلت لی ہے۔ مگر بھئی۔ ایسا خوبصورت خوب سیرت۔ خوش مزاج داماد بھلا کب کسی کو ملا ہے۔ آج کل تو ویسے بھی دل پسند دامادوں کا کال ہے۔ کال سمجھتے ہو؟ فون کال نہیں۔ قحط۔"

انہوں نے مسکراتی آنکھوں سے بیوی کو دیکھا۔

حسب توقع جواب خفگی میں ملا۔

"مجھے کیوں سنا رہے ہیں۔" انتہائی بے گانگی کا موسم ان کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا۔

"اتفاق سے۔ آپ لڑکے کی ماں ہیں۔" اخلاق صاحب نے دانت چمکائے۔

"ماں سمجھتے تو یوں غیروں کی طرح اطلاع دیتے؟ میری کوئی رضا نہیں۔ اجازت نہیں۔" آواز بھرا گئی۔

"او ہو۔ اجازت تو اس نالائق نے ہم سے بھی نہیں لی۔" وہ کچھ چونکے۔ "بس اپنی خواہش بیان کی۔ آخر بیٹا ہے۔"

"پہلوٹھی کا کہیے ابا جان۔" نوید نے جو سب سے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہیں سے ہانک لگائی۔

"ہاں پہلوٹھی کا۔ جانِ جگر ہے اپنا۔ اب وہ پینڈو ہے۔ جاہل ہے۔ گاؤں کی گنوارن ہے۔"

"ڈاکٹر بانی ہے۔" پیچھے سے اشارا ہوا۔

"زندگی ان صاحبزادے نے گزارنی ہے۔ ہم نے تو اپنی گزار لی۔ جیسے تیسے۔"

"ٹھیک ہے۔ گزاریں۔ میرا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں۔" وہ بھنا گئیں۔ "اس جیسے تیسے کا جواب نہیں۔"

"واہ۔ سب کچھ آپ ہی کریں گی۔ آخر بیٹے کی ماں ہیں۔ ہم نے تو لڑکی کی ماں سے سفارش کا وعدہ کیا تھا۔ وہ کر دی ہے۔ جس دن صبا، ندا کا نکاح ہو گا۔ اسی دن اسی گھر میں انجو دلہن بنے گی۔ اس کا باپ زندہ نہیں ہے۔ میں اس یتیم بچی کا سرپرست بنوں گا۔ بے شک رخصتی کے لیے ہم بارات گاؤں بھی لے جا سکتے ہیں۔"

"ہُرا" تالیاں۔

"خیر۔ میں کچھ نہیں کروں گی۔ اور مجھے کوئی اس نافرمان کی ماں سمجھے بھی نہیں۔ اور اگر سمجھتا ہے تو مردہ سمجھے۔"

معاملہ خاصا گمبھیر تھا۔ فضا میں خوف اور اندیشے تیرنے لگے۔ نوید آیا۔ لپٹ گیا کندھے پر سر رکھ کر کچھ منمن کی۔ آخر پہلوٹھی کا بیٹا تھا۔ نرم پڑیں۔ تو رونے لگیں۔ شکووں کا دفتر کھول دیا۔

"امی۔ دیکھیں!" نوید نے جواب شکوہ کا پہلا بند

اُٹھایا" ہمارے خاندان میں تو سب لڑکے دیکھ کر پسند کرتے ہیں۔ کوئی ان کے لیے نامزد ہے۔ وہ دوسری بہن کو منتخب کر لیں گے۔ چچا ابا نے بھی سنا ہے۔ کافی ضد کے پروگرام دکھا کر من مانی کی۔ دادی سے پوچھیں۔ اب اگر ابا جان نے یہ غلطی نہیں کی۔ تو میرا بخدا اس میں کوئی کردار نہیں۔ میں بے قصور ہوں۔"

ایک لمبا سانس لے کر وہ دوسرے بند کی طرف آیا۔

"اور امی! آپ کو تو خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اگر ابا جان بھی اپنی پسند سے شادی کر لیتے تو میں تو بے موت مارا جاتا۔ کھی کھی کھی۔"

کچھ دیر تو کوئی سمجھ نہ سکا کہ اس نے ایسی کیا بات کی ہے جس پر خود ہی ہنس رہا ہے۔ پھر ابا جان ہنسی روکتے ہوئے اُٹھے۔ اس کے سر پر دھپ رسید کر کے بولے۔

"نالائق۔ نامعقول۔ مذاق کرتا ہے۔"

"مذاق؛ ابا جان۔ بہت سنگین واقعہ ہوتا یہ۔ غور تو کریں۔"

"کر تب انجو آپا آپ کی بہن ہوتیں۔" درید نے معمہ حل کیا اور قہقہے گونجنے لگے۔

دادی نے نوید کو پاس بلا کر اس کے کان پکڑ لیے۔

"سن مسخرے۔ ہلکے پھلکے انداز میں زندگی گزارنا بہت اچھا ہوتا ہے لیکن بعض معاملے اور کئی رشتے اتنے گہرے ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ انصاف نہ کیا۔ تو دنیا میں بھی خوار اور اگلے جہان میں بھی۔ یہ بتا۔ ماں سے اس معاملے میں بات کیوں نہ کی۔"

"ابا جان سے کر لی تھی۔ کان چھوڑیے۔ کہا تھا امی کو بتا دیں۔ کان تو چھوڑیں۔ امی سے شرم آتی تھی۔"

"بڑا بے چارا شرمیلا۔ چلو۔ اب ماں سے اجازت لو۔"

"وہ نہیں دیں گی۔"

"تو پھر یہ شادی نہیں ہو گی۔"

دادی سنجیدگی سے اُٹھ کر جانے لگیں۔ نوید نے پہلے دادی کو پکڑ کر بٹھایا پھر ماں کے پیر پکڑ لیے۔ سر گھٹنے پر ٹکا دیا۔ اس کی ٹھوڑی ان کے گھٹنے پر چبھی تو انہیں ہنسی آنے لگی۔

"اٹھو۔ نوید۔" وہ بہ زور اسے ہٹانے لگیں۔ نوید نے پبلک کی طرف دیکھا۔ "ناک سے لکیریں کھینچوں؟" جواب زوردار ہاں میں ملا۔

"بس۔ بس۔ ٹھیک ہے۔" آخر ماں تھیں اور اقلیت میں تھیں۔

"تم خوش۔ تو میں بھی راضی۔" آخر کار دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

"اچھا ابا جان۔ گاڑی کی چابی دیں۔"

"کیوں۔ اس وقت کہاں جاؤ گے؟"

"انجو کو لے کر آتا ہوں۔ وہ بھی امی سے اجازت لے لے۔ پیر پکڑ لے۔ بڑا تیر بہدف نسخہ ہاتھ آیا ہے۔"

"چل ہٹ۔ مسخرا۔" دادی نے اس کو دھکیلا پھر شبانہ کو مبارکباد دی۔ سب کھڑے ہو کر گانے اور ناچنے لگے۔ اور ایک اودھم مچا۔

"میں افتخار بھائی کو بُلا کر لاتا ہوں۔" سعید نے اچانک کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" نوید نے چیخ کر کہا۔ "آ جاؤ افتخار۔" اور وہ دروازے کی اوٹ سے نکل کر آ گیا۔

پھر تو قہقہوں کا طوفان چھت پھاڑنے لگا۔

رات کو سونے سے پہلے اخلاق صاحب نے بیوی سے پوچھ لیا۔ "تم خوش ہو؟"

وہ کیا کہتیں۔ خوشی تو انہیں سب کے خوش ہونے کی تھی۔ لیکن ان کی ہار ہوئی تھی۔ وہ کیسے برداشت ہو گی۔

"جن دو لوگوں کو میں نے ذلیل کر کے گھر سے نکالا۔ وہی دندناتے ہوئے میرے گھر میں آئیں گے۔ آپ سوچیں۔ میں خوش ہو سکتی ہوں؟ عزت کر سکتی ہوں ان کی؟"

"کیوں نہیں۔ جب وہ ہمارے بچوں کی محبت بن کر آئیں گے۔ تو ہم ان سے محبت بھی کریں گے اور ان کی عزت بھی۔"

"یہ تو مجبوری کا سودا ہوا۔ خوشی کا نہیں۔ اور میں نے کبھی مجبور ہو کر خوشی پاتے نہیں دیکھا کسی کو۔"

"دیکھو۔ کچھ مجبوریاں ہم کو خوشی سے گوارا کرنی پڑتی ہیں۔ جن کو تم نے ذلیل کیا وہی عزت و احترام پانے کے لیے آ رہے ہیں۔ اسی گھر میں۔ جہاں سے نکالے گئے تھے۔ یقین کر لو کہ اس میں میری مرضی یا ضد نہیں۔ یہ ہماری بچوں کی خوشیاں ہیں۔ اور سچ پوچھو تو مجھے ان سے اختلاف نہیں۔ ذرہ بھر بھی نہیں۔ میں تو بہت مطمئن ہوں کہ ان میں اتنی سمجھ بوجھ ہے۔ کہ وہ صحیح فیصلے کر سکتے ہیں۔ تم نے ہمیشہ غلط فہمیوں۔ بدنفسی کے اظہار۔ اور غلط اندازوں کے سہارے کڑھ کڑھ کر گزار دی۔ اب تو اصلاح کر لو۔ دنیا جہاں ہے وہیں رہے گا۔ جس کی تقدیر میں دُکھ ہے اسے دُکھ اور جو نصیب میں سکھ لکھا لایا۔ اس نے سکھ پایا۔ تم نے اپنی خوش قسمتی کی قدر ہی نہیں کی۔ اسے دُکھ میں بدل ڈالا۔ اب غور کر لو۔ تمہارے کہنے سے کسی کا بُرا ہوا نہ تمہارے چاہنے سے کسی کا بھلا۔ یہ سب قدرت کے اشارے پر ہوتا ہے۔ اپنی عزت کی رکھوالی کرو۔ دوسروں پر تنقید چھوڑ دو۔ تم کسی کی عزت کرو گی تو دوسرے بھی تمہارا احترام کریں گے۔"

شبانہ نے تابڑ توڑ آئنی شکستیں کھائی تھیں۔ سانس بھی بُری نہیں۔ اولاد نے بھی قائل ہی کرنا چاہا۔ میاں کے لیکچر سے متاثر ہوئیں۔ انہوں نے کوئی شکوہ حوالے سے نہیں کیا۔ کتنا اعلا ظرف انسان ہے۔

صبح کو سب بیدار ہوئے۔ تو بڑا عجیب منظر تھا۔ لاؤنج میں نوید اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ جو سب سے آخر میں اٹھتا تھا۔

"کیوں برخوردار۔ کیا پروگرام ہے۔" اخلاق صاحب اخبار اٹھا لیا پڑھنے لگے۔

"ابا جان۔"

"ہوں۔" وہ اخبار میں گم تھے۔

"میرے والے سارے پروگرام کینسل کر دیں۔"

"ہوں۔ خبریں خاصی چٹپٹی ہیں۔ ہاں۔ کیا کر دیں کینسل؟"

"ابا جان۔ صبح انجو کا فون آیا تھا۔"

"اچھا؛ بھئی واہ۔ پینڈو نے کیسے ہمت کر لی۔ زبردست خبریں ہیں۔"

"وہ۔ اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔"

"کیا۔ کس نے کیا کر دیا ہے؟"

"انجو سے بات ہوئی تھی میری۔ ابا جان۔ انجو اب کسی کا اعتبار نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ہمارے گھر سے۔ سوائے ذلت، حقارت۔ اسے کیا ملا۔ اس لیے۔ وہ کہتی ہے۔ ایسی جگہ شادی کرے گی جہاں عزت کا تحفظ ہو۔ اور ہمارے ہاں، مایوسی کے سوا کچھ نہیں مل سکتا اسے۔"

سب جمع ہو گئے تھے۔ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں صبا، ندا رونے لگیں۔ شبانہ کو سخت غصہ آ رہا تھا۔

"نخریلی۔ کمینی۔ دماغ چل گیا ہے اس کا۔ ہے کیا۔"

"ہم جا کر اسے منا لیں گے۔ بھائی پلیز۔" ندا رو رو کر بے حال تھی۔

"کوئی نہیں جائے گا۔" نوید بولا تو اس کی آواز ٹوٹی

ابنِ انشاء کے سفرناموں کے سلسلے کا نیا سفرنامہ"

نگری نگری پھرا مُسافر

ابن انشا کے سفرناموں کے سلسلے کا آخری سفرنامہ ہے جو جولائی ۱۹۸۹ء میں پہلی بار چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اس سفرنامہ میں جاپان، روس اور لندن کے سفر کا احوال درج ہے۔

یہ کتاب خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہو گئی ہے اور مشہور کارٹونسٹ مجمی نے کارٹون بنائے ہیں۔

قیمت ۵۰ روپے

اس پتے پر خط لکھیں یا قریبی بک اسٹال سے خرید لیں،

لاہور اکیڈمی ۲۰۵ سرکلر روڈ، لاہور،

مکتبۂ عمران ڈائجسٹ، ۳۷، اردو بازار کراچی،

"تو بی مجبوری بھی تو سہی تھی۔" میں لاجواب ہو گیا ہوں اور میں نے اس کا اعتراض تسلیم کر لیا ہے۔ اور میں اس سے دستبردار ہو گیا ہوں۔ کیونکہ میں اس کی بات سمجھ گیا ہوں۔ رسوائی سے میں نہیں بچا سکا اسے۔ اور اس پر لگے الزام کے داغ بھی نہیں مٹا سکتا۔"

اس کے قدم اوپر کی جانب تھے اور وہ انتہائی مایوس۔ دکھی۔ اور شکست خوردہ نظر آ رہا تھا۔

"اور کل پھپھو کے بیٹے سے اس کی منگنی۔"

"بیٹے۔ بیٹے۔ اتنی مایوسی کی کیا بات ہے۔ میں ابھی صبو سے بات کرتا ہوں۔"

"نہیں۔ انجو نے کہا ہے۔ ان پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے۔ کیونکہ وہ اس کی اس ذلت اور تہمت کے راز سے واقف نہیں۔ اگر انہیں علم ہو گیا تو۔ وہ جان دے دیں گی۔"

ابا جان سر تھام کر بیٹھ گئے۔ ندا صبا زور زور سے رو رہی تھیں۔ جیسے ان کے گھر میں ماتم ہو۔ اخبار اخلاق کے ہاتھ سے گر کر منتشر ہو گیا تھا۔ اس کے صفحے الگ الگ پھڑپھڑا رہے تھے۔ نوید لڑکھڑاتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔ مایوس۔ ناکام۔ ہارا ہوا۔ زندگی سے بیزار۔ اس کے گلشن کو بہار سے پہلے خزاں نے اجاڑ دیا تھا۔ اور اس کی ذمہ دار اس کی اپنی عزیز ماں تھی۔

شبانہ کو نوید کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں

یہ ممتا کی آواز تھی۔ ان کو بہت تپش کا احساس ہو رہا تھا۔ نوید کے قدموں کی شکستہ آواز ان کے دل پر سنگ رہی تھی۔ ہر قدم ایک ٹیس بن کر چبھ رہا تھا۔ انہیں تو ایسا لگا جیسے ان کے سینے میں دل نہیں کوئی پھوڑا ہے۔ پک رہا ہے۔ ٹیسیں اٹھ رہی ہیں تو یہ ہوتی ہے ممتا۔ اولاد کی چاہت۔ پہلی بار ان کے دل پر چوٹ لگی تھی۔ ایسی چوٹ۔ ان کے آس پاس آگ سی لگ رہی تھی۔ سارا بدن جل رہا تھا۔ در و دیوار سے شعلے لپک رہے تھے۔ باغ جل رہا تھا۔ اور نوید کے دل میں آگ لگ گئی تھی۔

وہ چیخ پڑیں۔ "ہائے۔ کس ساعت میرے منہ سے وہ الفاظ نکلے تھے۔" پھر وہ بڑبڑانے لگیں۔

"ہاں۔ میں جاؤں گی۔ میں خود جاؤں گی۔ صبو کو مناؤں گی۔ انجو سے معافی مانگوں گی۔ اس گھر کی خوشی کے لیے۔ باغ کی بہار کے لیے۔ اگر باغ میں آگ لگی تو۔ بہار جھلس جائے گی۔ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ میں انجو کی پھپھو سے معذرت کروں گی۔ ان کے پیر پکڑوں گی۔ بیٹے کی خوشی کے لیے۔ اپنے جان جگر کے لیے۔"

گیلری سے اماں حواس باختہ چلی آ رہی تھیں۔ نوید سے انہیں معلوم ہو گیا تھا۔

"اماں!" وہ چیخ کر پہلی بار خلوص دل سے ساس کے ساتھ لپٹ گئیں۔ "اماں میرے دل میں آگ لگ گئی ہے۔ میں جل رہی ہوں اماں۔ میرے ہونٹ جل رہے ہیں۔ سارا گھر۔ سب کچھ۔ میں جا رہی ہوں اس آگ کو ٹھنڈا کرنے۔ میں صبو کے پاس جا رہی ہوں۔ میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گی بس۔ پیار۔ محبت سے انجو کو مانگوں گی۔"

"ہاں چلو۔ میں بھی چلتی ہوں۔ ہم انجو کو بڑی عزت سے لائیں گے۔ میں خوشامد بھی کر لوں گی۔ نوید کی خاطر۔" دادی پُرامید تھیں۔

"اماں۔ میں بھی۔ اس کی خاطر۔"

وہ چلا کر رونے لگیں۔ اس باغ اور اس کی بہار کی خاطر۔ ان پھولوں اور اس کی مہک کی خاطر اس گھر۔ اور اس کے امن کی خاطر۔ سورج اور شعاع کی خاطر۔ چاند اور چاندنی کی خاطر۔ اپنے جان جگر کی خاطر۔ ہر قربانی منظور ہے۔ دین اور اس کے وقار کی خاطر۔